قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا تہترواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

ستمبر 2016ء

لاہور

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

اے راہِ حق کے شہید و وفا کی تصویرو!
تمہیں وطن کی ہوائیں سلام کہتی ہیں

طلوعِ اسلام کا مقصد

جو احباب طلوع اسلام سے تعارف نہیں رکھتے ان کی آ گاہی کے لئے ہم طلوع اسلام کے مقصد کو وقتاً فوقتاً سامنے لاتے رہتے ہیں:

-1 تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کر سکتی۔ اسے اپنی راہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت۔

-2 خدا کی طرف سے عطا شدہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے ابد تک ضابطہ ہدایت ہے۔ لہٰذا اب نہ خدا کی طرف سے کسی کو وحی مل سکتی ہے نہ کوئی نبی یا رسول آ سکتا ہے۔ قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور حضور رسالتمآب ﷺ خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

-3 قرآن کریم کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس حد تک انسانی علم ترقی کر چکا ہے وہ انسان کے سامنے ہو اور چونکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ خدا نے تمام کائنات انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر ضروری ہے۔

-4 نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مقدسہ، شرف و عظمت انسانیت کی معراج کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضور ﷺ کی سیرت طیبہ کا جو حصہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضور ﷺ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضور ﷺ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہئے۔ یہی اصول صحابہ کبارؓ کی سیرت مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھا جانا چاہئے۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

-5 دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر ان سے خالص قوانین خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانین کی یہ اطاعت ایک نظام مملکت کی رو سے ہو سکتی ہے اس کے بغیر دین (جو نظام زندگی کا نام ہے) متمکن نہیں ہو سکتا۔

-6 رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآن کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں، ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے امور مملکت امت کے مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔

-7 رسول اللہ ﷺ کے بعد دین کا وہی نظام حضور ﷺ کے خلفائے راشدینؓ نے جاری رکھا۔ اس میں امور مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

جلد 69 شمارہ نمبر 09 ستمبر 2016ء

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور

ناشر و چیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق
خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

زرِتعاون	50 روپے فی پرچہ
پاکستان	550/- روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک	800/- روپے سالانہ
بیرون ملک	2500/- روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک	5000/- روپے سالانہ

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات	غلام احمد پرویزؒ	4
پرویز صاحب کا نظریۂ اسلامی مملکت (قسط 11)	منظور حسین لیل	8
مذہب اور دین۔۔۔ زمین و آسمان	ڈاکٹر سنبل	16
دنیا نظامِ محمدی ﷺ کے لیے بیتاب ہے	غلام احمد پرویزؒ	22
مسلمانوں کے زوال میں پرستش کا کردار	خواجہ ازہر عباس	41
قرآنی تعلیمات کے مطابق مرد عورت سے افضل نہیں۔۔۔	ڈاکٹر انعام الحق	48

ENGLISH SECTION

Manzil ba Manzil (منزل بہ منزل) Chapter 2: Life's Essence (*Khum-e Zindagi* - خم زندگی) – Message to Fellow-Seekers ② By G. A. Parwez , Translated by: M. Alam — 56

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

Idara Tolu-e-Islam Bank Account National Bank of Pakistan
Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465-22-003082-7

For International Transactions
IBAN: Pk21 NBPA 0465 0022 0003 0827
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ نمبر 2، لاہور۔ 54660، (پاکستان) فون: 042-35714546
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو، بے بال و پر نکلے
ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے

ہوئے مدفونِ دریا زیر دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھاتے تھے جو، بن کر گہر نکلے

غبارِ رہ گزر ہیں، کیمیا پر ناز تھا جن کو
جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو، اکسیر گر نکلے

ہمارا نرم رو قاصد پیامِ زندگی لایا
خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے

حرم رسوا ہوا پیر حرم کی کم نگاہی سے
جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے

زمیں سے نوریانِ آسماں پرواز کہتے تھے
یہ خاکی زندہ تر، پائندہ تر، تابندہ تر نکلے

جہاں میں اہل ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے، اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیر ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملت ہے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

غلام احمد پرویزؒ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لمعات

عید اضحیٰ

جنابِ پرویزؒ کی وہ تقریر جو نشرگاہِ دہلی سے 29 دسمبر 1941ء کی شام کو نشر ہوئی۔

مذہب کے متعلق عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ وہ ایک فرد کی ذاتی اصلاح کا ذریعہ ہے اس میں شبہ نہیں کہ افراد کی ذاتی اصلاح نہایت ضروری ہے لیکن یہ اصلاح اصل مقصد نہیں۔ عمدہ گھڑی کے ہر پرزہ کے لئے مضبوط اور درست ہونا ضروری ہے' لیکن اگر یہ پرزے الگ تھلگ پڑے ہوں تو ان کی پائیداری اور مضبوطی کسی کام کی نہیں۔ یہی پرزے جب ایک نظام کے تحت' ایک خاص ترتیب سے' ایک جگہ جمع کر دیئے جائیں تو ان میں سے ہر پرزہ کی حرکت' دوسرے پرزوں پر اثر انداز ہو گی اور اس طرح ان کی اس مجموعی حرکت کا جیتا جاگتا نتیجہ' محسوس شکل میں' گھڑی کے ڈائل پر نمودار ہو جائے گا۔ اسلام افراد کی اصلاح سے ایک ایسی جماعت پیدا کرنا چاہتا ہے جو نظامِ انسانیت کو عدل پر چلا سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اس نے ایک ایسا عملی پروگرام مرتب کر دیا ہے جس میں ہر قدم اسی منزل کی طرف اٹھتا ہے۔ نماز کے لئے پانچ وقت کا اجتماع۔ تقویٰ۔ ضبطِ نفس۔ غیر اللہ کی محکومی سے انکار۔ اللہ کی حاکمیت کا اقرار۔ مرکزیت۔ اجتماعیت۔ اطاعتِ امام کا عملی مظاہرہ ہے۔ جمعہ کے اجتماع میں یہ دائرہ وسیع تر ہو جاتا ہے۔ عید کی تقریب پر اس کی حدود اور زیادہ پھیل جاتی ہیں اور بالآخر حج کے میدان میں اس کی وسعتیں ساری دنیا کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہیں۔ رمضانِ مبارک کے پورے مہینے کی مشق و ریاضت کے بعد جب ذہنوں میں جلا۔ دلوں میں تازگیٔ ایمان' نگاہوں میں مومنانہ فراست اور خون میں مجاہدانہ حرارت پیدا ہو گئی تو عید الفطر کے اجتماع میں ہر مقام سے ملتِ اسلامیہ کی نمائندگی کے لئے بہترین افراد کا انتخاب ہوا۔ مسلم نمائندوں کے یہ قافلے دنیا کے دور دراز گوشوں سے جنگل' بیابان کوہ اور دریا کے مرحلوں کو طے کرتے ہوئے۔ مِنۡ کُلِّ فَجٍّ عَمِیۡقٍ اپنی بین الملی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے چاروں طرف سے ایک مرکز کی طرف سمٹے چلے آ رہے ہیں۔ دنیا میں کوئی جماعت بلا مرکز قائم نہیں رہ سکتی۔ مسلمانوں کے فکر و نظر کا مرکز قرآن۔ اطاعت کا مرکز امیر اور اجتماعیت کا مرکز وہ بیت الحرام ہے جو ایک خدا کے ماننے والوں کے مورثِ اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقدس ہاتھوں سے وجود میں آیا اور دنیا کے بتکدوں میں خدا کا پہلا گھر کہلایا۔ اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّ ہُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ (3:96) بلاشبہ پہلا گھر جو تمام انسانوں کے لئے (بطور مرکز) بنایا گیا ہے وہ یہی ہے جو مکہ میں ہے۔ برکت والا اور تمام دنیا کے لئے ہدایت کا سرچشمہ وَمَنۡ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا جو کوئی اس کے حدود میں داخل ہوا وہ امن اور حفاظت میں آ گیا۔

اسلام دنیا میں جس نظام کو قائم کرنے کے لئے آیا ہے اس کی بنا اس اصول پر ہے کہ تمام انسان ایک برادری کے فرد ہیں وہ

ان تمام غیر فطری حد بندیوں کو توڑنے کے لئے آیا ہے۔ جن سے انسانوں کی یہ برادری مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ نسل کا امتیاز۔ رنگ اور زبان کا امتیاز۔۔ جغرافیائی حدود کا امتیاز اس کے نزدیک سب غیر فطری حد بندیاں ہیں۔ اس لئے خدا کے اس گھر میں جب انسان جمع ہوں گے تو باطل کے ان امتیازات میں سے کوئی امتیاز باقی نہیں رہے گا۔ چینی، جاپانی، ہندی، افغانی، ایرانی، تورانی، حبشی، افرنگی سب ایک ملت کی شکل میں اس عظیم الشان حقیقت کا اعلان کرنے کے لئے جمع ہوں گے کہ تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے یہی نہیں بلکہ مختلف قسم کے لباسوں سے جو اعلیٰ اور ادنیٰ کے امتیاز کی جھلک نمودار ہو سکتی ہے اسلام نے اسے بھی روا نہیں رکھا اور حکم دے دیا کہ ارضِ حرم میں داخل ہونے سے پہلے سب ایک ایک بن سلی چادر میں لپٹے ہوئے حاضر ہوں۔ تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری۔ یہ ہے وہ وردی جو اسی بین الملی کانفرنس میں شرکت کرنے والوں کے لئے تجویز کی گئی ہے۔ یوں باطل کے ہر امتیاز کو مٹاتے' وحدت کے رنگ میں رنگے یہ قافلے چاروں طرف سے' اپنے مرکز کی طرف بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ سب ایک آقا کے غلام' ایک حاکم کے محکوم' ایک قانون کے تابع' ایک نظام کے پابند' فقیرانہ لباس' ننگے سر' گدایانہ وضع' قلندرانہ ادائیں' سکندرانہ جلال۔ دنیا بھر کے آستانوں سے بے نیاز' مستانہ وار گذرتے ہوئے ایک کی چوکھٹ پر سر جھکانے کے لئے بے تاب۔ دل وفورِ شوق سے بے قرار' آنکھیں مئے توحید سے نشہ بار لبیك اللهم لبیك کہتے ہوئے یوں رواں دواں' جانب مرکز کھنچے چلے آ رہے ہیں جیسے شہد کی مکھیاں' رنگ و بو کی فضاؤں کے جوہر اپنے سینوں میں بھر کر سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے شام کے وقت اپنے چھتے کی طرف پروانہ وار اڑتی چلی آ رہی ہوں کہ اپنی محنتوں کا سرمایہ' تگ ودو کا ماحصل۔ مرکز میں لا کر اکھٹا کر دیا جائے۔

زمانۂ ابراہیمیؑ میں رواج تھا کہ عہد و پیمان کی پختگی کے لئے ایک پتھر پر ہاتھ مارتے تھے۔ جب ان رہروانِ منزلِ شوق کے قافلے۔ حریمِ کعبہ میں پہنچے تو اس عہد و پیمان کی تجدید کے لئے جو انہوں نے اپنے اللہ سے باندھ رکھا ہے۔ حجر اسود کو چھوا۔ بعض نے ہجوم کی وجہ سے دور ہی سے اشارہ کر دیا۔ کسی نے پیمان کے تقدس کی رعایت سے ہاتھ کو چوم لیا اور یوں اس عہد کی تجدید ہوئی کہ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (6:162-163) میری نماز، میرا حج، میرا جینا، میرا مرنا سب کچھ اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام کائنات کا پروردگار ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے اور میں خدا کے فرمانبرداروں میں سب سے پہلا فرمانبردار ہوں۔

اس عہد و پیمان کی تجدید سے' وجد و مسرت اور سرمستی و شیفتگی کی وہ کیفیت طاری ہوئی کہ والہانہ انداز میں خدا کے اس گھر کے گرد' پروانہ وار گھوم رہے ہیں۔ کوئی کعبہ کی چوکھٹ پر سر رکھے محوِ نیاز ہے' کوئی اس کا غلاف تھامے عالمِ وارفتگی میں جھولی پھیلائے کھڑا ہے۔ دل میں مقدس آرزوؤں کا ہجوم، آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسو، لب پر دعائیں، محویت کا عالم، آسمان سے نور کی بارش، رحمتوں کا نزول، غرضیکہ ایک نئی دنیا اور ایک عجیب سماں ہے۔

خمخانۂ حجاز کے متوالوں کے یہ قافلے 8 تاریخ کو عرفات کے میدان کی طرف روانہ ہو گئے۔ پاک اور صاف، سر سے پاؤں تک للّٰہیت میں ڈوبے ہوئے۔ قدم وادئ مکہ میں۔ نگاہیں عرشِ معلیٰ پر، کوئی تیز گام کوئی آہستہ خرام۔ کشاں کشاں، 9 تاریخ کو اس میدان

میں آ جمع ہوئے۔ کیسا حسین نظارہ ہے۔ سب ایک آقا کے غلام، ایک ملت کے فرد ایک ہی وضع، ایک ہی انداز، بھائی سے بھائی ملا۔ ایک کا دوسرے سے تعارف ہوا کہ اس مقام کا نام ہی عرفات کا میدان ہے' اجتماع کیا ہے؟ مساوات اور محبت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے۔ جس میں ہر قطرہ' اپنے آپ کو خود سمندر محسوس کرتا ہے۔ یہ سب خدا کے حضور جمع ہوئے۔ ان کا منتخب امام منبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آیا۔ اس نے ملت کی اجتماعی حالت پر تبصرہ کیا اور سال بھر کے لئے ایک مرتب شدہ پروگرام کا اعلان کر دیا۔ جس کی تکمیل کے لئے دعائیں مانگی گئیں' التجائیں کی گئیں اور یوں یہ عظیم الشان اجتماع۔ زندہ آرزوؤں کی ایک نئی دنیا اپنے جلو میں لئے۔ دوسری صبح مِنیٰ کے میدان میں آ گیا۔ یہی وہ میدان ہے جہاں ملتِ حنفیہ کے پیشوائے اعظم۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کرنے کے لئے پیشانی کے بل لٹا دیا تھا اور یوں اپنے ایمان محکم کا عملی ثبوت دیا تھا کہ تیرا حکم ہو تو عزیز ترین متاع بھی بلا تامل نثار کر دی جاسکتی ہے۔ اس صحرائی قربانگاہ میں پہنچ کر ملتِ اسلامیہ کے ان نمائندوں نے اس اقرار کو دہرایا کہ تیرا نام بلند کرنے کے لئے جو پروگرام مرتب ہوا ہے اس کی تکمیل میں جس قربانی کی ضرورت ہوگی۔ بلا دریغ کر دی جائے گی۔ یہاں پہنچ کر مختلف ملکوں کے نمائندوں نے اپنے اپنے خیمے لگائے۔ یہ سب اللہ کے مہمان ہیں اس لئے خود ہی مہمان اور خود ہی میزبان ہیں آج صبح ہندی مسلمانوں کے ہاں سب کے کھانے کا انتظام ہے شام کو ایرانیوں کا اہتمام ہے۔ ان دعوتوں کے لئے قربانیاں کی جارہی ہیں۔ سامان تو کھانے پینے ہی کا ہے لیکن چونکہ وہ مقصدِ عظیم جس کے لئے یہ اجتماع ہوا ہے خالصتاً اللہ کے لئے ہے اس لئے یہ دعوتیں بھی دنیا کی دعوتوں سے نرالی ہیں۔

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ؕ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ (22:37)- اللہ تک ان قربانیوں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا۔ بلکہ تمہارے دل کا تقویٰ۔ پاکیزگیٔ مقصد پہنچتی ہے۔ اس نے ان جانوروں کو اس طرح تمہارے لئے مسخر کر دیا کہ تم اللہ کی راہنمائی پر اس کے نام کو بلند کرو۔ اور نیک کرداروں کے لئے بشارت ہے۔ دعوتیں اور ضیافتیں ہیں۔ ایک ملک کے مسلمان دوسرے ملک والوں کو اپنے مقامی حالات سے آگاہ کررہے ہیں' دماغی اور قلبی تعارف ہو رہا ہے۔ ادھر ادھر مختلف ملکوں کی مصنوعات کی نمائش لگ رہی ہے۔ خرید و فروخت ہو رہی ہے۔ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ (2:198) اس میں کوئی حرج نہیں کہ تم (حج میں) اپنے رب کا فضل (یعنی معیشت) کماؤ۔ اس طرح یہ اجتماع ملت اسلامیہ کے لئے دینی اور دنیاوی۔ سیاسی۔ اقتصادی۔ معاشی۔ معاشرتی فوائد کا ذریعہ بن رہا ہے کہ حج کا مقصد یہی ہے لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ تاکہ لوگ اپنے فوائد کے لئے حاضر ہوں۔

تین دن تک یہ اجتماع رہا جس میں عالم اسلامی کے ہر گوشے اور ملت اسلامیہ کے ہر شعبے کے متعلق باہمی تبادلہ خیالات ہوا۔ ادھر یہ ہو رہا ہے۔ ادھر تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ملت کے افراد۔ اپنے اپنے ہاں وادیٔ مکہ کے اجتماع سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے عیدگاہوں میں جمع ہو رہے ہیں۔ ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے نیز اس پروگرام کو سننے کے لئے جس کا اعلان ایک دن پہلے میدان عرفات میں ہوا ہے۔ اس پروگرام کی اطلاعیں ریڈیو، ٹی وی، انٹرنیٹ اور تار برقی سے تمام عالم اسلامی تک پہنچ چکی ہیں۔ مقامی مسلمان عیدگاہوں میں پہنچے۔ اپنے اپنے خطیبوں سے اس پروگرام کو سن لیا اور سمجھ لیا جس پر اب سال بھر عمل کیا جائے گا۔ وہ تھا حج یہ

ہے عید۔ وہ فریضۂ مقدس جس میں نوعِ انسانی کے قیام و بقاء کا راز ہے۔ تمام انسانوں کا اس لئے کہ مسلمان دنیا میں اپنے ہی لئے نہیں جیتا بلکہ اس کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ تمام دنیا کو اس نظام پر چلائے جس سے انسانیت بڑھے۔ پھولے۔ پھلے اور عروج وارتقاء کی منزلیں طے کر کے اس منزل سے اگلی منزل میں جا پہنچے۔ حج اس نظام کی سب سے اہم کڑی اور کعبہ اس نظام کا مرکز ہے۔ جَعَلَ اللّٰہُ الْکَعْبَۃَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ قِیٰمًا لِّلنَّاسِ (5:97)۔ اللہ نے کعبہ کو جو حرمت کا گھر ہے تمام انسانوں کے لئے (امن وعافیت کے) قیام کا ذریعہ بنایا ہے۔ انسانوں نے مختلف خطوط پر مختلف قسم کی جمعیتیں بنا بنا اور بگاڑ بگاڑ کر مختلف تجربے حاصل کئے ہیں اور ہر تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ۔۔۔ تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی۔۔۔ یہ سب اس لئے کہ جن اصولوں پر یہ جمعیتیں بنائی گئیں وہ سب غیر فطری تھے۔ فطرت کے مطابق تو ایک ہی اصول ہے اور وہ یہ کہ انسانوں کی تقسیم ملکوں اور قوموں کی رو سے نہ کی جائے بلکہ تمام انسانوں کو ایک عالمگیر برادری تصور کر کے انہیں ایک مرکز کے ماتحت خدا کے قانون کے تابع رکھا جائے۔ یہی وہ عظیم الشان اصول ہے جس کی رو سے مکہ کو ''ھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ'' تمام دنیا کے لئے ہدایت کا سرچشمہ اور کعبہ کو ''قِیٰمًا لِّلنَّاسِ'' تمام نوع انسانی کے قیام کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ اس جمعیت آدم کا فطری نتیجہ ہے دنیا کا امن وسکون۔ وَمَنْ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا جو اس میں داخل ہوا۔ امن و حفاظت میں آ گیا حج اور عید اسی منزل کے نشانِ راہ ہیں۔

خریدار حضرات توجہ فرمائیں

مجلہ طلوعِ اسلام کی درج ذیل خوبصورت جلدیں 600 روپے فی جلد علاوہ ڈاک خرچ دستیاب ہیں۔

1970ء	1972ء	1975ء	1976ء
1977ء	1983ء	1984ء	1985ء
1986ء	1987ء	1988ء	1991ء
2009ء	2010ء	2011ء	2012ء
2013ء	2014ء	2015ء	

ملک منظور حسین لیل۔ بھکر
0332-7636560
mhleeladv@yahoo.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قسط 11

پرویز صاحب کا نظریۂ اسلامی مملکت

(قرآنی حکومت)

اور جو لوگ ما انزل اللہ (قرآن) کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، وہی لوگ کافر، ظالم، فاسق ہیں (5:44-45-47)

نظامِ معیشت

صلوٰۃ اور معاشیات:

طلوعِ اسلام جولائی 1972ء، ص:17:۔ ''حضرت شعیب نے جب اپنی دعوت کا آغاز کیا تو ان کی قوم نے سمجھا کہ یہ خدا پرست انسان لوگوں کو ایشور کی بھگتی اور پوجا پاٹ کی تلقین کرتا ہے، سو یہ بات قابلِ اعتراض نہیں اس لئے اسے اس کی اجازت دے دینی چاہیئے۔۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے دیکھا کہ یہ شخص ان کے کاروباری معاملات میں بھی دخل اندازی کرنے لگ گیا ہے۔ کبھی ان سے کہتا ہے کہ:۔ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ ۔دیکھو! اپنے ماپ اور تول کے پیمانے کم نہ رکھو۔: اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۔ٹھیک ٹھیک ماپو، صحیح صحیح تولو۔۔ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ (11:84-85)۔ گاہک کو اس کی ادا کردہ قیمت کے مطابق چیز دو۔ نہ اس میں کمی کرو، نہ ملاوٹ۔ اور کبھی ان سے کہتا ہے کہ:۔ وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ۔ ایسا نہ کرو کہ مختلف شاہراہوں پر راہزن بن کر بیٹھ جاؤ، بارڈروں پر جا کر سمگلنگ کرو: وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا (7:86)۔ اور جو دیانتدار انسان تمہیں اس روش سے روکے، اسے ڈرانے دھمکانے لگ جاؤ۔۔ اس پر وہ لوگ بڑے متعجب ہوئے اور حضرت شعیب سے کہنے لگے کہ تم نے ہم سے ''صلوٰۃ'' کی اجازت مانگی تھی اور ہم نے اس کی یہ سمجھ کر اجازت دے دی تھی کہ تم اگر اپنے طریق پر خدا کی پرستش کر لیا کرو تو اس پر ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ لیکن: یا شعیب! اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ ...اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (11:87) تمہاری یہ صلوٰۃ کس قسم کی ہے جو ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنے مال کو اپنی مرضی کے مطابق صرف میں لا سکیں۔۔۔ نماز کو معاشی نظام سے کیا واسطہ! نماز کا تعلق مذہب سے ہے، معاشیات کا تعلق امورِ دنیا سے۔ یہ تمہارا مذہب کس قسم کا ہے جس کا دائرہ، معاشیات تک کو بھی محیط ہے۔ آپ نے غور فرمایا عزیزانِ من! کہ سیکولر نظامِ زندگی کا تصور کچھ عصرِ حاضر کی ایجاد نہیں۔ دین اور مذہب کا یہ فرق شروع سے چلا آ رہا ہے۔ اربابِ سیاست و معاشیات کو اس سے کچھ تعرض

نہیں ہوتا کہ لوگ مذہبی عقائد کس قسم کے رکھتے ہیں، اور پرستش اور پوجا پاٹ کس طور طریق سے کرتے ہیں۔ یہ مذہب کی دنیا ہے جس کی وہ پوری پوری آزادی دے دیتے ہیں۔ لیکن وہ اس کی اجازت نہیں دے سکتے کہ مذہب، دنیاوی معاملات میں بھی دخل اندازی کرے۔ (اسے دین کہتے ہیں)۔ قومِ شعیب کا تصورِ زندگی بھی سیکولر انداز کا تھا۔ اسی لئے وہ حضرت شعیب کی اُس دعوت پر متعجب اور معترض تھے جس کی بنیاد ''دین'' پر تھی۔''

روٹی کی محتاجی:

طلوعِ اسلام دسمبر 1972ء، ص:19: ''انسان کو انسان کے سامنے جھکانے کا ایک اور موثر حربہ یہ تھا کہ اسے روٹی کا محتاج بنا دیا جائے اور اس طرح اسے بھوکا رکھ کر، اس سے اپنا ہر حکم منوا لیا جائے۔ آپ نے سرکس کے شیر کو دیکھا ہوگا۔ اس میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ ایک رنگ ماسٹر کو تو کیا، وہ جنگلے کے اندر کے تمام آدمیوں کو چبا سکتا ہے۔ لیکن آپ نے دیکھا کہ وہ، رنگ ماسٹر کے ہنٹر کے سامنے، کس طرح چیختا اور دھاڑتا، ہر وہ حرکت کرتا ہے جس کا اسے اشارہ کیا جاتا ہے۔۔ یہ کیوں؟ محض بھوک کی وجہ سے۔ یہی حربہ صاحبِ قوت انسانوں نے، دوسرے انسانوں کو اپنا محکوم بنانے کے لئے اختیار کیا۔ انہوں نے رزق کے سرچشموں پر قبضہ کر لیا اور اس طرح دوسروں کو محتاج بنا کر، ان سے اپنا ہر حکم منوانے لگے۔ اس طرح انسان، شرفِ آدمیت سے عاری ہو کر، بھوکے حیوانات کی سطح پر آ پہنچا۔۔۔ قرآن آیا اور اس نے واضح الفاظ میں اعلان کر دیا کہ رزق کے معاملہ میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج نہیں: نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ (6:151)۔ ہم تمام افراد کے رزق کے ذمہ دار ہیں۔۔ اُن کے بھی اور ان کی اولاد کے بھی۔ ہم ایسا نظامِ معاشرہ قائم کرنے کی ہدایت کرتے ہیں جس میں رزق کے سرچشمے انسانوں کی ملکیت میں رہنے کی بجائے، تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ بنیں۔

اور کوئی کسی کا محتاج و محکوم نہ ہو۔ غور فرمایئے! کہ اس اعلان سے، انسان کو کس قدر جانگسل ذلت اور روح فرسا محکومیت سے نجات مل گئی۔ سوچیے برادران گرامی! کہ تاریخ انسانیت کا کیا یہ ایسا انقلاب نہیں جس پر نوعِ انسان، مسرت کے جشن منائے!۔''

معاشی نظام:

طلوعِ اسلام فروری 1971ء، ص:38: ''قرآن کریم نے کہا ہے کہ مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں، بلکہ وہ ایک بلند و بالا مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور وہ مقصد یہ ہے:۔ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (22:41)۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ہم زمامِ اقتدار ان کے ہاتھ میں دیں گے تو یہ:۔ (1) اقامتِ صلوٰۃ کا انتظام کریں گے۔ (2)۔ ایتائے زکوٰۃ کریں گے۔ (3)۔ ایسے قوانین کا نفاذ کریں گے جو قرآن کی رو سے قابل قبول ہوں۔ (4)۔ ان قوانین و رسوم کو منسوخ کر دیں گے جنہیں قرآن ناپسند کرتا ہو۔ (5) غرضیکہ، ان کے تمام معاملات، پروگرامِ خداوندی کی تکمیل کے لئے ہوں گے۔ ان مقاصد میں سے ہم سرِ دست، ''ایتائے زکوٰۃ'' سے بحث کریں گے کیونکہ اسی کا تعلق موضوعِ زیرِ نظر سے ہے۔ ہمارے ہاں ''ایتائے زکوٰۃ'' کا

ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ وہ زکوٰۃ دیں گے۔۔ اور زکوٰۃ سے مراد یہ لیا جاتا ہے کہ جمع شدہ مال و دولت سے، سال کے بعد، اڑھائی فیصد روپیہ نکال کر غریبوں کو دے دینا۔ ایتائے زکوٰۃ کا یہ مفہوم قرآنی نہیں۔ اوّل تو اس لئے کہ اس قسم کی (اڑھائی فیصد والی)، کا قرآن کریم میں کہیں ذکر نہیں۔۔ دوسرے یہ کہ اس قسم کی زکوٰۃ دینے کے لئے مسلمانوں کی اپنی حکومت کا ہونا لازمی نہیں۔ یہ زکوٰۃ تو ہم ہندوستان میں انگریز کی محکومی کے زمانے میں بھی دیا کرتے تھے، اور ہندوستان کا مسلمان، ہندو کی محکومی میں رہتا ہوا، اب بھی دے سکتا ہے اور دیتا ہے۔

ایتائے زکوٰۃ:

یہ ''ایتائے زکوٰۃ'' تو کوئی ایسا فریضہ ہے جو صرف اپنی آزاد مملکت ہی میں سرانجام دیا جاسکتا ہے بلکہ یوں کہئے کہ یہ افراد کا نہیں، خود مملکت کا فریضہ ہے۔ اور تیسرے اس لئے کہ قرآن کریم کی رو سے مال و دولت جمع کرنے کی اجازت ہی نہیں، اس لئے جمع کردہ مال و دولت پر زکوٰۃ کا تصور صحیح نہیں ہوسکتا۔۔۔ ''زکوٰۃ'' کے معنی ہیں بڑھنا، پھولنا، پھلنا، نشوونما پانا۔۔۔ قرآن نے کہا یہ ہے کہ جب دنیا میں جماعتِ مومنین برسرِ اقتدار آئے گی تو ان کی حکومت کا فریضہ ہوگا کہ وہ افرادِ معاشرہ کو سامانِ نشوونما بہم پہنچائے۔ سامانِ نشوونما میں، انسان کی طبعی زندگی کی ضروریات روٹی، کپڑا، مکان، آسائش، علاج معالجہ اور اس کی انسانی صلاحیتوں کی برومندی کے لئے ضروری انتظامات، سب آجاتے ہیں۔۔۔ دوسری جگہ، اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ (23:4)۔ یہ لوگ (مومنین) زکوٰۃ (سامانِ نشوونما بہم پہنچانے) کا انتظام کرتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ نوعِ انسان کو سامانِ زیست (رزق) بہم پہنچانے کی ذمہ داری خدا نے خود اپنے اوپر لے رکھی ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ: نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ (6:152)۔ ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔۔۔ جو مملکت خدا کے نام پر قائم ہو، اس کا فریضہ ہوتا ہے کہ انسانوں کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہیں، وہ انہیں پورا کرے۔ لہٰذا، اسلامی مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچائے۔ اور ظاہر ہے کہ کوئی مملکت ایسی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتی جب تک وسائلِ پیداوار اس کی اپنی تحویل میں نہ ہوں۔ اگر وسائلِ پیداوار افراد کی ذاتی ملکیت میں رہیں تو مملکت اپنی اس ذمہ داری کو پورا کس طرح کرسکتی ہے؟

زمین کی حیثیت:

وسائلِ پیداوار میں بنیادی حیثیت ''زمین'' (ارض) کو حاصل ہے اور زمین کو خدا نے، اَرْضُ اللّٰهِ (11:64)۔ ''خدا کی زمین'' قرار دیا ہے۔ اسے نوعِ انسان کے لئے روزی کا سامان بتایا ہے۔ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ؕ (7:10)۔ اس میں جو کچھ ہے۔ رِزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ ہے یعنی بندوں کے لئے رزق (50:11)۔ لہٰذا، اسے۔ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ (41:10)۔ رہنا چاہیئے۔ یعنی تمام ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے یکساں طور پر کھلی۔۔ اسے۔ وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ

(56:73)۔یعنی تمام بھوکوں کے لئے سامانِ رزق ہونا چاہیئے۔زمین سے ایک تو سامانِ خوراک برآمد ہوتا ہے اور دوسرے وہ تمام خام مسالہ (Raw Material) معدنیات وغیرہ جن سے مصنوعات تیار ہوتی ہیں۔۔لہٰذا، وَمِمَّآ اَخۡرَجۡنَا لَكُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ‌ؕ (2:267) میں زراعت اور صنعت وحرفت، دونوں آجاتی ہیں۔اب رہی انسانوں کی کمائی، تو اسے قرآن نے اَمۡوَالَ النَّاسِ، یا اَمۡوَالُكُمۡ کہہ کر پکارا ہے۔یعنی لوگوں کا مال یا تمہارا مال۔لیکن اس مال پر بھی کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔کیونکہ، جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے، ایک شخص مومن کہلاتا ہی اس وقت ہے جب وہ اس معاہدہ پر دستخط کر دیتا ہے جس کی رو سے وہ اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔اِنَّ اللّٰهَ اشۡتَرٰى مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ وَاَمۡوَالَهُمۡ بِاَنَّ لَهُمُ الۡجَـنَّةَ‌ؕ (9:111)۔لہٰذا، مومن کا مال بھی اُس کی ذاتی ملکیت میں نہیں رہتا۔یہی وہ نظام ہے جس کے متعلق کہا کہ: وَيَسۡـئَلُوۡنَكَ مَاذَا يُنۡفِقُوۡنَ ؕ۔اے رسول! یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم اپنے مال میں سے کس قدر ''زکوٰۃ'' (افرادِ انسانیہ کو سامانِ نشوونما پہنچانے) کے لئے دے دیں۔کہا کہ ان سے کہہ دو۔قُلِ الۡعَفۡوَ‌ؕ (2:219)۔جتنا تمہاری اپنی ضروریات سے زائد ہے سب کا سب۔اس نظام کی رو سے آپ دیکھیئے کہ: (1) نہ تو زمین کسی کی انفرادی ملکیت میں رہتی ہے اور (2) نہ ہی فالتو روپیہ (Surplus Money) کسی کے قبضے میں رہتا ہے۔لہٰذا، اس میں جائیدادیں بنانے کا امکان ہی نہیں ہوتا اور چونکہ، تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے، اس لئے اس نظام میں، ملازمین کی تنخواہیں یا مزدوروں کی اُجرت (Wages) مقرر کرنے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا اس نظام کا بنیادی اصول یہ ہوتا ہے کہ: ہر فرد، اپنی اپنی استعداد کے مطابق، وہ کام کرے، جسے، اس کی اہلیت وصلاحیت کے پیشِ نظر اس کے سپرد کیا گیا ہو۔اور ہر ایک کی ضروریاتِ زندگی مملکت کی طرف سے پوری ہوتی رہیں۔ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے وسائلِ پیداوار کا مملکت کی تحویل میں رہنا ضروری ہے یہ ہے قرآن کے معاشی پروگرام کا منتہیٰ۔اسلامی مملکت کے لئے ضروری ہوگا کہ اسے اپنے آئین میں بطور نصب العین (Ultimate Goal) درج کرے اور اس کے بعد ایک عملی پروگرام مرتب کرے جس کی رو سے آہستہ آہستہ، بتدریج اس منتہیٰ تک پہنچا جاسکے۔''۔۔

طلوعِ اسلام اگست 1971ء، ص:8: ''یہ ہے اسلام کے معاشی نظام کا ماحصل۔اور جب ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ مملکت پاکستان کا نظام اسلامی ہوگا، تو اسلامی نظام اس کے سوا کوئی اور ہو نہیں سکتا۔یاد رکھئے! یہ جو ہمارے ''علماء کرام'' اس نظام کو غیر اسلامی کہتے ہیں تو ان میں سے جو دیانت دار ہیں ان کی بھول یہ ہے کہ انہوں نے قرآنی نظام کی بجائے، اس نظام (سرمایہ داری) کو اسلامی سمجھ رکھا ہے جو ہمارے دورِ ملوکیت کی پیداوار ہے لیکن جس نے ملوکیت کی سحر کاری کی بدولت، اسلامی لبادہ اوڑھ لیا تھا۔اور (ان میں سے) جو اس حقیقت کو جانتے ہیں، وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ سرمایہ داروں کے آلۂ کار ہیں۔ہم اس موضوع پر اس سے پہلے بہ تکرار واصرار، شرح وبسط سے لکھ چکے ہیں، اس لئے اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔اس مقام پر، ہم صرف اتنا دہرا دینا کافی سمجھتے ہیں کہ:۔اسلامی زندگی کا مکمل اور احسن نمونہ حضور نبی اکرم ﷺ کی

سیرتِ طیبہ ہے۔ اور دنیا کا بڑے سے بڑا عالم بھی یہ ثابت نہیں کرسکتا (بلکہ کہنے کی جراءت بھی نہیں کرسکتا) کہ حضور ﷺ کے پاس کوئی ذاتی جائیداد تھی یا حضور ﷺ نے کوئی جائیداد یا نقد دولت اپنے ترکہ میں چھوڑی تھی۔ (یہاں ہم نے شیعہ حضرات کے عقائد کو نہیں چھیڑا)۔ اس عظیم ترین شہادت کے بعد، یہ ثابت کرنے کے لئے اور کون سی دلیل یا شہادت کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ اسلام میں ذاتی جائیداد کی اجازت نہیں۔ اس میں سب کچھ عقیدۃً خدا کی ملکیت ہوتا ہے اور عملاً اس امت کی تحویل میں رہتا ہے جو دنیا میں قوانین خداوندی کے نفاذ کی ذمہ داری اپنے سر لیتی ہے۔ امت کے اس نظام کو اسلامی حکومت کہا جاتا ہے۔ اپنے ہاں یہ نظام رائج کیجئے۔ اور پھر دیکھئے کہ ہم بھک منگوں کی صف سے نکل کر کس طرح ''غنی عن العالمین'' (مستغنی عن الکل) کی صفتِ خداوندی کے مظہر، اور خیر الرازقین کے شرف کے حامل نہیں بنتے۔؟۔''

قرآن کا معاشی نظام:

طلوعِ اسلام اگست 1972ء، ص:39: ''قرآن کریم اپنے کلی معاشی نظام کو بطور نصب العین پیش کرتا ہے، لیکن اس تک پہنچاتا ہے احوال وظروف کے مطابق، بتدریج۔ اس مقصد کے لئے وہ اس کے عبوری دور کے لئے بھی راہنمائی دیتا ہے اور انتہائی مرحلہ کے لئے بھی۔ آیئے، ہم پہلے، اس کے پیش کردہ عبوری نظام کے خدوخال کا مشاہدہ کریں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ وہ اس نظام کو، جس میں انسان کے جسم کی پرورش کے تقاضے باطمینان پورے نہ ہوتے ہوں، خدا کا عذاب قرار دیتا ہے۔ یعنی وہ نظام جس میں افرادِ معاشرہ اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم رہ جائیں۔ اسے عام طور پر بھوک اور افلاس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سورۃ النحل میں ہے کہ ہم اس حقیقت کو ایک مثال کے ذریعے سمجھاتے ہیں۔ ایک بستی تھی۔ جو نہایت امن اور اطمینان سے رہتی تھی۔ سامانِ زیست نہایت افراط اور فراوانی سے اس کی طرف کھنچے چلا آتا تھا۔ لیکن اس کے رہنے والوں نے خدا کی ان نعمتوں کی قدر نہ کی۔ اور اپنا خود ساختہ غلط نظام اپنے ہاں رائج کرلیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر خوف اور بھوک کا عذاب طاری ہوگیا۔ رزق کی فراوانیاں بھی ختم ہوگئیں اور امن کی طمانیت بخشیاں بھی (16:112)۔ سورۃ طٰہٰ میں ہے کہ جو لوگ ہمارے قوانین سے اعراض برتتے ہیں، ان کی روزی تنگ ہوجاتی ہے۔ اور ہم انہیں قیامت کے دن بھی اندھا اٹھائیں گے (20:124)۔ یہ نکتہ بڑا غور طلب ہے کہ قرآن کریم کی رو سے، اس دنیا میں رزق کی تنگی، انسان کی عاقبت خراب کرنے کا موجب بھی ہوجاتی ہے۔ اسی سورۃ میں چند آیات پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ اس دنیا میں جنت کی زندگی کی محسوس علامات کیا ہیں؟۔ یہ کہ:۔ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۝ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى (20:118-119)۔ اس میں نہ کھانے پینے کے متعلق کوئی پریشانی ہوگی، نہ لباس اور مکان کے متعلق کوئی فکرمندی۔ اس میں کیفیت یہ ہوگی کہ: وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (2:35)۔ ہر شخص کو، ہر جگہ پیٹ بھر کر کھانے کو مل جائے گا۔ کسی کی کوئی ضرورت رکی نہیں رہے گی۔ ان تصریحات سے ہم نے دیکھ لیا کہ قرآن کریم کا دعوٰی یہ ہے کہ: (1) اگر نظامِ معاشرہ اس کے متعین کردہ اصولوں کے مطابق متشکل کرلیا جائے تو اس کا نتیجہ سامانِ زیست کی فراوانی ہوگی اور (2) اگر ان اصولوں سے اعراض برتا گیا تو اس کا نتیجہ بھوک

اور افلاس ہوگا جو خدا کا عذاب ہے۔

زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی:۔ ان اصولوں میں سرفہرست یہ اصول ہے کہ ذرائع پیداوار پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔۔ زمانۂ نزولِ قرآن میں، ذریعۂ پیداوار، زمین تھی۔ انڈسٹری (صنعت کاری یا نظامِ کارخانہ داری) ابھی وجود پذیر نہیں ہوئی تھی۔ ویسے بھی اگر دیکھا جائے تو ذریعۂ پیداوار اپنی اصل کے اعتبار سے، زمین ہی ہے۔ اسی کی پیداوار ہے جسے کارخانے مختلف شکلوں میں ڈھالتے ہیں۔ اس لئے قرآن کریم نے نہایت واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ زمین خدا کی ملکیت ہے اس لئے اُس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔

خدا کی ملکیت:

اس سلسلہ میں، سب سے پہلے اس اصول کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ جس چیز کو قرآن ''خدا کی ملکیت'' کہتا ہے، اس سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام نوعِ انسان کے فائدے کیلئے ہے۔ اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ اس حقیقت کو اس نے ایک تاریخی واقعہ سے نہایت بصیرت افروز انداز سے واضح کیا ہے۔ قومِ ثمود کے زمانہ میں معاش کا دارومدار گلہ بانی (مویشی پالنے) پر تھا۔ قوم کے مستبد سرداروں نے چراگاہوں اور چشموں پر قبضہ کر کے، کمزور انسانوں کے مویشیوں کو ان سے متمتع ہونے سے محروم کر رکھا تھا۔ ان کے اس نظام کو توڑنے کے لئے، آسمانی انقلاب کے داعی، خدا کے رسول، حضرت صالح اٹھے۔ کافی جدوجہد کے بعد، ان کے مخالفین اس پر رضامند ہو گئے کہ چراگاہیں اور چشمے تمام مویشیوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رہیں گے۔ لیکن حضرت صالح نے کہا کہ جب تک اس معاہدہ کا عملی ثبوت سامنے نہ آجائے، یقین نہیں کیا جا سکتا کہ تم اس پر قائم رہو گے۔ اس کا عملی ثبوت یہ ہوگا کہ یہ ایک اونٹنی ہے۔ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ۔ اس کے متعلق یہ نہ سمجھو کہ یہ زید کی، بکر کی، امیر کی، غریب کی اونٹنی ہے۔

نَاقَةُ اللّٰهِ:

اس کے متعلق بس یہ سمجھو کہ یہ خدا کی اونٹنی ہے۔: فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ (11:64)۔ یہ خدا کی اونٹنی ہے اور یہ خدا کی زمین ہے۔ اس اونٹنی کو آزاد چھوڑ دو کہ یہ خدا کی زمین میں چرے چگے۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم نے ''نَاقَةُ اللّٰهِ'' اور ''اَرْضِ اللّٰهِ'' کہہ کر کیسے حسین اور بلیغ انداز سے اس حقیقت کو واشگاف کر دیا کہ ذرائع رزق کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتے۔ انہیں خدا کی مخلوق کے فائدے کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے۔۔ قرآن نے اس بنیادی اصول کو اس شرح و بسط سے بیان کیا ہے کہ اس مقالہ میں ان تمام مقامات کا احاطہ مشکل ہے۔ اس لئے یہاں صرف چند ایک آیات کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ (مثلاً)، (1) خدا نے زمین کو تمام مخلوق کے فائدے کے لئے بنایا ہے (55:10)، (2) اس میں تمہارے لئے معاش، یعنی روزی کا سامان ہے (7:10، 15:20)، (3) اس میں بندوں کے لئے رزق ہے (5:11)، (4) رزق کے یہ دروازے ہر صاحبِ ضرورت کے لئے یکساں طور پر کھلے رہنے چاہئیں (41:10)، (5) تم اس رزق کو خود بھی کھاؤ

اور اپنے مویشیوں کو بھی کھلاؤ (20:54)، (6) کسی کو زمین کا مالک سمجھنا، اسے خدا کا شریک بنانا ہے (2:22) فرعون یہی کہتا تھا کہ یہ زمین میری ہے۔ اس میں بہنے والے دریا میرے ہیں۔ اس لئے۔ اَنَا رَبُّکُمُ الۡاَعۡلٰی (79:24)۔ میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔ اس کے اس دعوے کے ابطال کے لئے اس کی طرف صاحبِ ضربِ کلیم، حضرت موسیٰ جیسے عظیم انقلاب آفریں پیغمبر کو بھیجا گیا تھا۔ قرآن کریم کا یہی وہ اساسی دعویٰ ہے جس کی بناء پر علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ:۔

حق زمیں را جز متاعِ ما نہ گفت
ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت
باطنِ الارض للہ ظاہر است
ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

یعنی ''الارض للہ'' کہنے سے مقصود، خدا کی شانِ ملکوتی کا اظہار نہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ زمین پر کسی انسان کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی۔ ایسا نہ سمجھنا (یعنی کسی انسان کو زمین کے رقبے کا مالک قرار دینا) کفر ہے۔ شرک ہے۔: فلا تجعلوا للہ انداداً (2:22، 23:84، 10۔ 9:41)۔ سوائے مسلمانو! دیکھنا تم خدا کے شریک اور ہمسر نہ کھڑے کر دینا۔''

خدا کی زمین خدا کی مخلوق کیلئے:

طلوعِ اسلام اپریل 1974ء، ص: 27: ''اب ہم اگلی منزل کی طرف آتے ہیں تو وہاں قومِ ثمود ہمارے سامنے آتی ہے۔ ان کی معیشت گلہ بانی، یعنی مویشی پروری تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کا انحصار، چراگاہوں اور چشموں پر تھا۔۔ وہاں کیفیت یہ تھی کہ ''ملاء'' قوم نے ان چراگاہوں اور چشموں پر اپنا قبضہ کر رکھا تھا۔ اور کمزوروں اور ناتوانوں کے مویشیوں کو ان کے قریب تک آنے کی اجازت نہ تھی۔۔ اربابِ قوت کا دعویٰ تھا کہ وہ ان کی ذاتی ملکیت ہیں جن میں کوئی اور دخیل نہیں ہو سکتا۔۔ خدا کا ایک عظیم پیغمبر (حضرت صالح) ان میں اٹھا اور ملاء قوم سے کہا کہ یہ سراسر ظلم اور دھاندلی ہے کہ تم خدا کی زمین اور اس کی پیداوار کو اپنی ذاتی ملکیت بنائے بیٹھے ہو۔: هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمۡ اٰيَةً فَذَرُوۡهَا تَاۡكُلۡ فِىۡۤ اَرۡضِ اللّٰهِ (11:64)۔ زمین خدا کی ہے اور مخلوق بھی خدا کی۔ خدا کی زمین، خدا کی مخلوق کے لئے یکساں طور پر کھلی رہنی چاہیئے۔ کسی کو حق حاصل نہیں کہ اس پر لکیریں کھینچ کر یہ کہہ دے کہ یہ رقبہ میرا ہے۔ اس میں کوئی دخیل نہیں ہوسکتا۔ خدا کی ملکیت کو اپنی ملکیت قرار دے لینا خدا کا شریک بن جانا ہے (2:22)۔ سردارانِ قوم نے اس انقلابی آواز کی مخالفت کرنی تھی۔ سو انہوں نے اس کی مخالفت کی اور سخت مخالفت کی۔ لیکن حضرت صالح، اپنی دعوت کو مستحکم سے مستحکم کرتے چلے گئے۔ تآنکہ وہ ان سے اس قسم کے معاہدہ پر مجبور ہوگئے کہ امیر، غریب، سب کے جانور باری باری پانی پیئیں گے (91:11)۔ لیکن وہ اس معاہدہ پر قائم نہ رہے اور پھر اُسی دھاندلی پر اتر آئے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا، اسے قرآن نے ایک ایسے جامع لفظ سے واضح کیا ہے جس سے حقیقت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ انہوں نے قوم کو اونچے اور نیچے طبقوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ انہوں نے خدا کی بخششوں کے راستے میں بند

لگا رکھے تھے (17:20)۔انہوں نے زمین پر حدیں باندھ رکھی تھیں۔قرآن میں ہے: فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا (91:14)۔خدا کے قانونِ مکافات نے وہاں ایسا روڈ رولر یا بُل ڈوزر چلایا کہ سب اونچ نیچ برابر کر دی اور اس کے بعد ہے: وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا (91:15)۔دنیاوی حکومتوں کو تو اس کا ڈر رہتا ہے کہ بڑے بڑے لوگوں پر ہاتھ ڈالا تو نتیجہ اچھا نہیں ہوگا اس لئے وہ ان سے ڈرتے رہتے ہیں اور جرائم کے راستے میں کوئی روک نہیں رہتی۔لیکن خدا کا قانون کسی سے نہیں ڈرتا۔اس لئے اسے اس کا خوف نہیں ہوتا کہ بڑے بڑے لوگوں پر ہاتھ ڈلنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ لَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ۔وہ اس قسم کے عواقب (Consequences) سے قطعاً نہیں گھبراتا۔''

طلوعِ اسلام اکتوبر، نومبر 1977ء، ص:110:۔''انہوں (سردارانِ قومِ صالح علیہ السلام) نے کہا کہ ہمیں منظور ہے کہ (یہ جانور سب خدا کی مخلوق ہیں۔تمہارے بھی اور ان دوسرے لوگوں کے بھی اور زمین ساری خدا کی ہے جسے اُس نے اپنی مخلوق کے لئے ذریعہ رزق بنایا ہے لہٰذا، چراگاہیں سب مویشیوں کے لئے کھلی رہنی چاہئیں) آپ (حضرت صالح) نے کہا کہ بہت اچھا۔لیکن یہ ایک عملی مسئلہ ہے۔اس لئے اس کا ثبوت بھی عملی ہونا چاہیئے۔وہ عملی ثبوت یہ ہے کہ یہ ایک اونٹنی ہے۔اس کے متعلق یہ سمجھو کہ یہ نہ میری ہے نہ تیری۔نہ زید کی نہ عمر کی۔یہ اللہ کی اونٹنی ہے اور یہ زمینیں بھی اللہ کی ہیں۔اگر تم نے اس اونٹنی کو آزاد چرنے چگنے دیا تو سمجھ لیا جائے گا کہ تم اپنے معاہدہ کے پابند ہو۔اور اگر اس کے راستے میں رکاوٹ ڈالی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اس سے منحرف ہو گئے ہو۔قرآن کریم کے الفاظ میں۔ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ (7:73) یہ نَاقَةُ اللّٰهِ ہے اور وہ اَرْضِ اللّٰهِ، نَاقَةُ اللّٰهِ، ارض اللہ میں چرے چگے گی۔اللہ اللہ خیر سلا۔آپ غور کیجئے، قرآن کریم نے ان چار الفاظ میں، اس اقتصادی مسئلہ کا حل کس جامعیت سے پیش کر دیا ہے، جو تاریخ انسانیت میں سب سے زیادہ وجہ ءِ نزاع و فساد رہا ہے اور اب تک ہے۔اس نے کہا یہ ہے کہ ذرائع رزق پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی۔ انہیں تمام مخلوق کے لئے کھلا رہنا چاہیئے۔حضرت صالح نے، اپنے پیشِ نظر خاص واقعہ کی نسبت سے ناقۃ اللہ کہا ہے۔حضور نبی اکرم ﷺ نے اسے عالمگیر اصول قرار دینے کی جہت سے فرمایا کہ: زمین اللہ کی ہے۔اور بندے بھی اللہ کے ہیں۔اس لئے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے کھلی رہنی چاہیئے۔(ابوداؤد)۔زمین بھی خدا کی اور بندے بھی خدا کے۔اس لئے خدا کی زمین، خدا کے بندوں کے لئے کھلی رہنی چاہیئے۔اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی۔'' (اس معاملے میں علامہ اقبالؒ کے نظریات، خصوصاً ''بالِ جبریل'' میں شامل نظم ''اَرْضِ اللّٰهِ'' کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔مؤلف)

(جاری ہے)

ادارہ طلوعِ اسلام کا ای میل ایڈریس Idarati@gmail.com

ڈاکٹر سنبل، اسلام آباد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مذہب اور دین ۔۔۔ زمین و آسمان

اللہ فرماتے ہیں کہ ’’ہم نے ہر بستی اور ہر قوم میں اپنے پیامبر بھیجے اور یہ سارے ایک ہی دین لائے: دینِ اسلام‘‘ یہ پیغام صرف اُسی بستی کے لیے ہوتا تھا جہاں پیغمبر تشریف لاتے۔ ہر آنے والا پیغمبر ایک نیا پیغام لاتا جو پرانے پیغام کا ہی ترمیم شدہ ایڈیشن ہوتا۔ ہر دور میں اُس عہد کی ذہنی سطح کے مطابق پیغام آتا اور جب انسان ذہنی بلوغت کو پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے اپنا آخری پیغام اپنے آخری پیغمبر ﷺ کی وساطت سے بھیجا۔ ایک مکمل دین یعنی ایک مکمل نظام زندگی جو پہلے پیغاموں کی طرح نسلی یا علاقائی نہ تھا بلکہ ساری بنی نوعِ انسان کے لیے تھا آنے والے تمام زمانوں کے لیے۔

قرآن میں صرف چند پیغمبروں کا ذکر ہے جن سے اہل عرب واقف تھے اور جن کے وہ قصّے کرتے تھے۔

۞ غالب امکان ہے کہ جو مذاہب اس وقت دُنیا میں وجود رکھتے ہیں۔ ان کے بزرگ یا بانیان دراصل اللہ کے پیغمبر ہی تھے۔ جیسے کرشن مہاراج، مہاتما بدھ، مہاویرا اور جناب زردشت وغیرہ۔

۞ ہر زمانہ میں پیغمبروں کی مخالفت کی گئی۔ ان کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کی گئیں۔ پیغمبروں نے اپنے مخالفین سے ہمیشہ کہا کہ وہ اپنا کام کریں اور انہیں اپنا کام کرنے دیں۔ نتائج خود فیصلہ کر دیں گے کہ کون صحیح ہے اور کون غلط۔ لیکن مخالفین کو چونکہ اس پیغام میں اپنی بربادی نظر آتی تھی لہٰذا وہ مخالفت جاری رکھتے حتیٰ کہ نوبت لڑائی تک پہنچ جاتی۔ جس کے نتیجے میں حق کو فتح نصیب ہوتی اور دین کا قیام عمل میں آتا۔ اپنے علاقہ میں قیامِ دین کے بعد مومن اپنے قرب و جوار میں جبر استبداد، ظلم و ناانصافی اور غلامی کے خلاف جدوجہد شروع کرتے کہ یہی اللہ نے اُن پر فرض قرار دیا ہے۔

۞ نئے نظام میں اپنی فلاح و بہبود پا کر ان علاقوں کے لوگ جوق در جوق دینِ اسلام میں داخل ہوتے۔ مخالف ہتھیار رکھتے جاتے اور اللہ کے سپاہی آگے بڑھتے جاتے غرضیکہ مختصر مدّت میں ہزاروں بلکہ لاکھوں مربع میل کے علاقہ میں امن و سلامتی، خوشحالی اور شادمانی کا دور دورہ ہوتا۔ دینِ اسلام کی اس کامیابی کو دیکھ کر آج کے محقق اور دانشور حیران رہ جاتے ہیں۔ دراصل وہ اس کا محرک سمجھنے سے قاصر ہیں۔ جب تک آپ دین کو نہ سمجھیں۔ آپ اُس طاقت و توانائی کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے جو قوتِ ایمانی ایک مسلم میں بھر دیتی ہے ۔

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا

۞ بعدازاں، پیغمبر اور اس کے ساتھ قیامِ دین میں شامل نسل کے رخصت ہوتے ہی مفاد پرست گروہ اکھٹا ہوتے ہیں۔ پاؤں جماتے ہیں اور آہستہ آہستہ دین کی شکل اور خدوخال تبدیل کردیتے ہیں۔ اس طرح وہ دین جو ایک نظامِ زندگی ہوتا ہے اُسے مذہب یعنی پوجا پاٹ سے بدل دیتے ہیں۔ جتنا پرانا دین تھا۔ آج اتنی ہی زیادہ اُس کی شکل بگڑی ہے۔ تقریباً موجودہ تمام مذاہب دینِ اسلام کی ہی بگڑی ہوئی شکل ہیں۔

۞ صدیوں کے تناظر میں دیکھیں تو دین انتہائی مختصر مدّت کے لئے قائم ہوتا ہے جبکہ مذہب اس کے بعد صدیوں برسر اقتدار رہتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ دین کی برق رفتار کامیابی ہی ہے۔ دین کا تیزی سے پھیلاؤ ہی اُس کے زوال کی وجہ بنتا ہے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں لاکھوں لوگ دین میں داخل ہوتے ہیں لیکن یہ سب آتے ہوئے اپنے عقائد اور رسوم ورواج ساتھ لاتے ہیں چونکہ ان کی مناسب تربیت اور کتاب وحکمت کی تعلیم نہیں ہوتی لہٰذا وہ دین اور مذہب میں فرق نہیں سمجھتے اور اسی کا فائدہ مفاد پرست گروہ اٹھاتے ہیں اور مذہب کو دین بنا کر پیش کرتے ہیں۔

ہمارے ہاں آج تک دین اور مذہب کو مترادف سمجھا گیا اور اب بھی سمجھا جاتا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے دونوں کا فرق جانچنا ضروری ہے، اس طرح سمجھیں کہ:

دین:

نام ہے اطاعتِ قوانین خداوندی کا۔

نام ہے عقل وفکر اور تدبرّ کا۔

نام ہے اعتدال، برداشت اور مذہبی رواداری کا۔

نام ہے تسخیر کائنات اور اسے جنت بنانے کا۔

نام ہے دوسروں کے لئے زندہ رہنے کا۔

غرض دین ایک صاف حیات بخش ندی ہے جبکہ

مذہب:

نام ہے شخصی قوانین کی اطاعت کا

نام ہے اسلاف پرستی اور تقلید کا

نام ہے مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری کا

نام ہے فرقہ بندی اور فرقہ پرستی کا

نام ہے اپنے لئے زندہ رہنے کا

غرض مذہب ایک ٹھہرے پانی کا جوہڑ ہے جو بُو دیتا ہے۔

اسی فرق کو مفکر پاکستان نے اس طرح بیان کیا کہ۔

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے تیرے دِل میں میری بات
یا وسعت افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح ومناجات
وہ مذہب مردانِ خود آگاہ وخدا مست
یہ مذہب مُلّا وجمادات ونباتات

اس سے زیادہ خوبصورت اور واضح انداز میں دین و مذہب کے فرق کا بیان کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔

دین پر عمل پیرا ہوں تو نتائج اسی دنیا میں نظر آتے ہیں جبکہ مذہب وعدۂ فردا پر ہی گذارا کرتا ہے۔ اس کے پیروکار آخرت کی اُمید پر ہی جیتے ہیں۔ نہ دُنیا ملتی ہے اور نہ آخرت۔

❁ دین کی جگہ لینے والا مذہب صدیوں اُس توانائی کے بل بُوتے پر قائم رہتا ہے جو دین نے فراہم کی ہوتی ہے۔ مذہب۔ دینی مقاصد کو پسِ پشت ڈال کر اسلام کے نام پر نمود نمائش لوٹ مار اور مُلک گیری کی ہوس میں لڑائیوں کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع کرتا ہے۔ اس قتل وغارت اور ظلم وبربریت کی وجہ سے تاریخ میں مذہب کی جو بدنامی ہوتی ہے وہ دین کے حصے میں بھی آتی ہے کیونکہ اسے ہمیشہ سے مذہب ہی سمجھا گیا ہے حالانکہ اگر بغور جائزہ لیں تو دونوں کے مقاصد اور جنگ کے محرکات میں بھی واضح فرق موجود ہے۔ دینی لڑائیوں کا محرک ظلم وجبر و ناانصافی کا خاتمہ اور غلام قوموں کی آزادی ہے جبکہ مذہبی لڑائیاں اس کے برعکس قوموں کو غلام بنانے، علاقوں پر قبضہ کرنے اور لوٹ مار کی غرض سے لڑی جاتی ہیں۔

❁ تاریخِ انسانی مذہبی جنگوں کی داستانوں سے بھری ہے لیکن خالصتاً دین کے لئے کامیاب جدوجہد کی دو بڑی مثالیں تاریخ سے ہمیں ملتی ہیں۔ پہلی زمانۂ قدیم سے زردشت کے پیروکار سائرس اعظم کی جدوجہد اور دوسری حالیہ دور میں صدرِ اوّل کے مسلمانوں کی جدوجہد۔

پہلی مثال 600-500 BC کے عہد سے ملتی ہے۔

اہلِ یونان کا فارس سے عناد اور تعصب کی وجہ سے پڑا ہوا اڑھائی ہزار سال پرانا پردہ اُس وقت چاک ہوا جب پچھلی صدی کے آغاز میں ماہرین آثارِ قدیمہ نے بابل کے کھنڈرات دریافت کئے اور سچائی سامنے آئی۔ کھنڈرات سے ملنے والی شہادتیں اہلِ فارس کی عظمت وعروج کی داستانیں بیان کرتی ہیں۔ جو شواہد سامنے آئے انہوں نے ایک مردِ مومن کے دامن پر لگے وہ داغ مٹائے جو یونانی تاریخ دانوں نے لگائے تھے۔ یہ تھے جناب سائرس جنہیں اہلِ فارس ''کوروش بزرگ'' یا خورش جبکہ عرب کیخسرو اور تاریخ سائرس اعظم کے نام سے جانتی ہے۔

جناب سائرس نے صرف تیس سال کی مختصر مدّت میں زمانہ قدیم کی سب سے وسیع وعریض سلطنت (Persian Empire) کی بنیاد رکھی۔ آغاز میں آپ نے میڈیا اور فارس (جدید ایران) کو اکھٹا کیا۔ اسی نسبت سے قرآنِ کریم آپ کو ذوالقرنین (دوسینگوں والا) کہتے ہیں۔ تاریخ اور قرآن دونوں گواہ ہیں کہ آپ نے مظلوموں کی دادرسی، ظالموں کی بیخ کنی اور غلام قوموں کی آزادی کے لیے متعدد مہمات سرانجام دیں۔ آپ نے مغرب میں لیڈیا (Asia. minor) مشرق میں بکڑیا (بلخ) شمال میں کاکیڈیا (Caucasus) اور بابل سے بنی اسرائیل کی آزادی کے لئے مہمات کیں پہلی تین کا ذکر قرآن جبکہ چوتھی کا ذکر توراۃ میں ہے۔

آپ کے زیر سایہ تیس سے زائد قومیں آباد تھیں۔ جو اپنے مذہب اور ثقافت پر آزادی سے عمل کرتی تھیں۔ آپ نے کسی قوم کو نہ غلام بنایا اور نہ بیگار میں کسی سے کام لیا۔ مملکت کے طول وعرض میں رفاعِ عامہ کے کام کرائے۔ آپ کا انسانی حقوق کا اعلامیہ (Cyrus Cylinder) آج بھی اقوام متحدہ کے ہیڈکوارٹر کی زینت ہے۔

۞ وحشت وبربریت کے اُس دور میں یہ سب کچھ وحیٔ الٰہی کی رہنمائی کے بغیر ممکن نہ تھا۔ 530 BC میں آپ کی وفات کے بعد خاندانی بادشاہت قائم ہوئی۔ دین مذہب سے بدل گیا اور اہلِ یونان سے لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا جو 330 BC میں یونانی جرنیل سکندرِ اعظم کی یورش اور فارسی سلطنت کے دارالحکومت پرسی پولس کو جلا کر خاکستر کرنے پر ختم ہوا۔ صرف 30 سالہ ''دینی'' حکومت کے بعد دوسو سال ''مذہبی'' حکومت قائم رہی۔

دینی جدوجہد کی دوسری مثال حالیہ دور سے ہے۔

۞ چھٹی صدی عیسوی میں رسول ﷺ اور ان کے رفقاء نے چالیس سال کی مدّت میں 22 لاکھ مربع میل کے علاقہ میں دینِ اسلام قائم کیا اور دنیائے جدید کی سب سے پہلی مکمل فلاحی ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ اُس وقت جو اصلاحات کی گئیں آج بھی دُنیا ان پر عمل پیرا ہے۔

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

۞ آپ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے رخصت ہوتے ہی سازش نے سر اٹھایا ملوکیت قائم ہوئی۔ حکومت سیکولر ہوگئی۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کو تقسیم کر کے اللہ کی اطاعت کو علیحدہ اور رسول کی اطاعت کو علیحدہ قرار دے دیا گیا۔ قرآن کی مثل کتابیں (حدیث وفقہ) لکھی گئیں۔ قرآن مخملیں غلاف میں لپیٹ کر طاق میں سجا دیا گیا۔ قوانینِ خداوندی کی جگہ شخصی قوانین نے لے لی۔ مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری نے جڑ پکڑی اور دیکھتے ہی دیکھتے تناور درخت کی شکل اختیار کر گئیں۔ اس طرح کچھ ہی عرصہ میں دین اسلام کی جگہ مذہب اسلام وجود میں آیا۔

40 سالہ دینی دور کے بعد ہزار سال سے مذہب کی اجارہ داری ہے اور دنیا میں دین کا نام ونشان نہیں۔

۞ زمانۂ قدیم سے مذہب نے اللہ اور اس کے دین کے نام پر جو تباہی اور بربادی مچائی۔ جتنی قتل و غارت کی۔ اُس کے ذکر ہی سے مہذب دُنیا کی آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے۔ پچھلے دور میں کلیسا (مذہب عیسائیت) نے جو کچھ یورپ اور عیسائی دُنیا کے ساتھ سلوک کیا اُس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مغرب نے خدا اور کلیسا کو اپنی زندگی سے خارج کر دیا۔ اب مسلمان اُن کے نقشِ قدم پر ہیں۔ جسِ درندگی کا مظاہرہ اس وقت اللہ اور اسلام کے نام پر کیا جا رہا ہے یہ اُس کا لازمی نتیجہ ہوگا۔

۞ مسائل میں گھیرا آج کا انسان ایک ایسے جدید مذہب کی تلاش میں ہے جو اُس کی تمام مشکلات کو حل کر دے اور دُنیا جنتِ نظر بنا دے۔

دُنیا جو موجودہ مذاہب سے مایوس ہو چکی ہے اُسے یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ وہ جس کی تلاش میں ہے وہ مذہب نہیں بلکہ دین ہے۔ دین اسلام جس نے ماضی میں بھی درخشاں نتائج دیئے اور جو نظری طور پر آج بھی اسی کا دعویدار ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم دین اور مذہب کے فرق کو سمجھیں اور انسانیت کو دینِ اسلام کے حقیقی چہرے سے روشناس کرائیں۔

پروفیسر خالد سلام انتقال فرما گئے

دُکھی دل کے ساتھ یہ اطلاع دی جارہی ہے کہ پروفیسر خالد سلام 20 جولائی کی شام کینیڈا کے میکنزی ہیلتھ سنٹر میں وفات پا گئے۔ وہ ایک ماہ سے اس ہسپتال میں داخل اور بڑی جرأت اور حوصلہ کے ساتھ بیماری کے ساتھ نبرد آزما رہے۔ مرحوم پاکستان میں جیولوجی کے پہلے گریجوایٹس میں سے تھے۔ یونیورسٹی آف ٹیکنالوجی میں یہی موضوع پڑھاتے بھی رہے۔

خالد سلام کے والدِ محترم شیخ سلام صاحب اور ان کی والدہ محترمہ مسز سلام صاحبہ قرآنی فکر کے شیدائی تھے یہی وجہ تھی کہ ان کے بچوں میں قرآن کی محبت گویا گھٹی میں ملی تھی۔ خاص طور پر خالد سلام صاحب مرحوم اس سلسلہ میں کافی فعال رہے۔ وہ بزم طلوعِ اسلام کے رُکن رہے بعد ازاں بزم طلوعِ اسلام لاہور کے نمائندہ بھی رہے۔ پرویز صاحب سے براہِ راست کسبِ علم کرتے رہے۔ پرویز صاحب کے شرحِ جاوید نامہ کے سلسلہ کے آڈیو دروس میں پرویز صاحب نے خالد سلام کا ذکر محبت کے ساتھ کیا ہے اور کہا کہ مجلس قلندرانِ اقبال کے کم عمر ترین شرکاء میں خالد سلام شامل ہیں۔

مرحوم کینیڈا شفٹ ہو گئے تھے اور وہاں بھی بزم طلوعِ اسلام ٹورانٹو کینیڈا کے پروگرام میں شرکت کرتے رہے۔ دعا ہے کہ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب ہو اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل۔ ادارہ مرحوم کے اہلِ خانہ اور ان کے بہن اور بھائی کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یکے از مطبوعات باغبان ایسوسی ایشن

۞ باغبان ایسوسی ایشن کا ماٹو ''قرآنی فہمی اور باغبانی'' ہے۔

۞ باغبانوں کے غیر رسمی مقامی اجتماعات ہر ماہ کی 15۔30 تاریخ ہوتے ہیں جن میں وہ اپنے تجربات ومشاہدات پر مشاورت کرتے ہیں۔کیا آپ نے بھی اس کی ابتداء کی ہے؟

۞ شجرکاری میں مثالی طور پر حصّہ لیں۔

جاگتے رہو

(باغبان دانشوروں کی چند تجاویز)

۞ چین میں خاندانی منصوبہ بندی کے تحت ایک فیصلہ کیا گیا کہ شادی شدہ جوڑا صرف ایک بچہ پیدا کرے گا۔ 1970ء تا 31 دسمبر 2015ء اس میں عمل درآمد کیا گیا یکم جنوری 2016ء دو بچے پیدا کرنے کی اجازت مل گئی اور خاندانوں میں خوشی پیدا ہوئی۔ہم نے دوقومی نظریہ پر ایک ملک حاصل کیا اور دوقومی نظریہ کے ساتھ کیا گیا۔قوم اس طرح نہیں بنتی۔ہجوم اور قوم میں فرق ہوتا ہے۔آیئے قومی یکجہتی کے کچھ تو فیصلے کریں۔اردو زبان میں تعلیم،اردو میں عدالتی فیصلے۔

۞ ''امنِ علم اور تحفظ'' کا سہ تکونی مینار ہر تعلیمی ادارے کے سامنے بنایا جائے۔

۞ فرمانِ قائداعظم ''کام،کام اور کام'' کا موٹو استعمال میں لایا جائے اور اس پر ٹیم ورک کی حیثیت سے کام کیا جائے۔

۞ بے وقوف اُس کو کہتے ہیں جو کام میں وقوف، وقفہ،سوچنے کا وقت استعمال میں نہ لائے۔جب آپ وقوف کا باقاعدگی سے استعمال کریں گے تو آپ عملی طور پر بے وقوف نہیں رہیں گے۔

۞ قرآن کے مطابق حکومت قائم کرنا مسلمانی کا اعلیٰ ترین معیار اور سب سے بڑی نیکی ہے۔جس کو سنّت رسول اللہ بھی کہا جاسکتا ہے۔

۞ ''ربّ العلمین'' کے نام پر ربّانی فنڈ قائم کریں۔اس سے مستحق لوگوں کی امداد اور بلا سود قرض حسنہ دیا کریں۔آج اس کی بڑی ضرورت ہے۔

۞ علم تسخیر کائنات سے اہل مغرب کو تغلب حاصل ہوا۔

شعبۂ نشرواشاعت باغبان ایسوسی ایشن

غلام احمد پرویزؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دنیا نظامِ محمدی ﷺ کے لیے بیتاب ہے

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست

رحمۃ للعالمینی انتہاست

عزیزانِ گرامی قدر، سلام و رحمت:

یہ ہماری کس قدر خوش بختی ہے کہ ہمیں پھر ایک بار اس تقریبِ مبارک و مسعود میں شرکت کا موقعہ ملا ہے جو وجہِ شرفِ انسانیت اور باعثِ نورانیتِ عالم ہے۔ مبداءِ فیض کی اس کرم گُستری پر ہم اس کی بارگاہ میں جتنے سجودِ تشکر و نیاز بھی ادا کریں، کم ہیں اور پھر یہ حقیقت بھی کس قدر وجہ ٔ شادابیٔ قلب و نظر ہے کہ یہ تقریب اس موسمِ بہار میں آئی ہے جس میں زندگی تازہ شادمانیوں کی نمود کا پیغام لیے ہر شجرِ کائنات سے انگڑائیاں لیتی ہوئی بیدار ہوتی ہے۔۔۔عیدِ میلادالنبی ﷺ کی تقریب اور بہار کا موسم، کیسا حسین و جمیل ہے یہ امتزاج!

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، اس تقریبِ سعید پر بارگاہِ رسالتمآب ﷺ میں میرے نذرانہ عقیدت کا عنوان ہے ''دنیا نظامِ محمدی ﷺ کے لیے بیتاب ہے''۔ اس موضوع تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ واضح کیا جائے کہ ایک رسول کا فریضہ ٔ زندگی کیا ہوتا ہے؟ چونکہ ہمارے ہاں اسلام، دین کی حیثیت سے نہیں، مذہب کی شکل میں مروّج ہے، اس لئے عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ رسول بھی محض وعظ و نصیحت کے لیے تشریف لاتے تھے اور لوگوں کو اخلاقی اصلاحات کی ترغیب دے کر اپنا فریضہ ادا کر جاتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ رسول افرادِ معاشرہ کی اخلاقی تہذیب کا فریضہ بھی سرانجام دیتے تھے، لیکن یہ چیز مقصود بالذّات نہیں ہوتی تھی۔ یہ ایک ارفع و اعلیٰ مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی تھی اور وہ مقصد ہوتا تھا انسانوں کی تمدّنی، تہذیبی، ثقافتی، عمرانی، معاشرتی، معاشی، سیاسی زندگی میں انقلاب برپا کرنا۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے مجموعۂ خطبات کے پانچویں خطبہ میں رسول ﷺ کے اس فریضہ کو بڑی جامعیت سے واضح کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

فریضۂ رسالت ﷺ:

> ''محمد عربی ﷺ، فلک الافلاک کی بلندیوں پر پہنچ کر واپس تشریف لے آئے۔ خدا شاہد ہے کہ اگر میں اس مقام پر پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ آتا''۔ یہ الفاظ ایک بہت بڑے صوفی بزرگ (عبدالقدوس گنگوہیؒ) کے ہیں۔ تصوّف کے تمام لٹریچر میں ان جیسے اور الفاظ کا ملنا غالباً مشکل ہے، جو ایک فقرے کے اندر شعورِ نبوّت اور تصوّف کے اس قدر لطیف نفسیاتی فرق کو اس طرح واضح کر دیں۔ ایک صوفی اپنے انفرادی تجربہ کی تجردگاہ

سے واپس آنا نہیں چاہتا اور جب واپس آتا بھی ہے (اس لئے کہ اسے واپس آنا پڑتا ہے) تو اس کی یہ مراجعت نوعِ انسانی کے لئے کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس، ایک نبی کی مراجعت تخلیقی مقصد کے لیے ہوتی ہے۔ وہ آتا ہے کہ زمانے کے طوفان پر تسلط پا کر تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں لے آئے اور اس طرح مقاصد کی ایک نئی دنیا تعمیر کردے۔ ایک صوفی کے لئے اس کے انفرادی تجربہ کی تجردگاہ آخری مقام ہوتی ہے، لیکن ایک رسول کے دل میں اس سے زلزلہ انگیز نفسی قوتیں بیدار ہوجاتی ہیں، جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام دنیائے انسانیت میں ایک انقلاب پیدا کریں۔ یہ آرزو کہ جو کچھ اس نے دیکھا ہے وہ ایک جیتی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکل ہوجائے، نبی کے دل میں پیش پیش ہوتی ہے۔ اسی لئے ایک صاحبِ وحی کے تجربہ کی قدروقیمت جانچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے انسانیت کو جس قالب میں ڈھالا ہے، وہ کیسا ہے اور اس کے پیغام کی رُو سے جس قسم کی دنیائے ثقافت اُبھر کر سامنے آگئی ہے وہ کس انداز کی ہے۔"

میں اس وقت ان تفاصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ تصوّف کی حقیقت کیا ہے اور جنہیں صوفی کے مقامات کہا جاتا ہے، ان کی ماہیت کیا۔ اس وقت صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ علامہ اقبالؒ نے جس فریضہ رُسالت کی وضاحت کی ہے، وہ کس قدر اہم ہے اور اس سے رسول، دیگر مصلحین، مبلغین اور واعظین سے کس قدر ممتاز اور منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ حضور نبیٔ اکرم ﷺ نے اپنے اس عظیم فریضہ کو کس حسن وخوبی سے سرانجام دیا، کماحقہ، سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک ہم یہ نہ دیکھیں کہ ظہورِ نبوی ﷺ کے وقت دُنیائے انسانیت کی حالت کیا تھی؟ اس کے لیے ہم اپنی طرف سے کچھ نہیں کہنا چاہتے، ایک غیر مسلم محقق کی شہادت پیش کرنا کافی سمجھتے ہیں۔ (Denison) ایک ممتاز مؤرخِ تہذیب ہے۔ اس نے اپنی کتاب (Emotion as the Basis of Civilisation) میں اس زمانے کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

اس وقت (ظہور اسلام کے وقت) ایسا دکھائی دیتا تھا کہ تہذیب کا وہ قصرِ مشیّد جو چار ہزار سال میں جا کر تعمیر ہوا تھا، منہدم ہونے کے قریب پہنچ چکا ہے اور نوعِ انسانی پھر اس بربریت کی حالت کی طرف لوٹ جانے والی ہے جہاں ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے خون کا پیاسا تھا اور آئین وضوابط کو کوئی جانتا تک نہ تھا۔ قدیم قبائلی آئین اپنی قوت واحترام کھو چکے تھے، اس لئے اب ملوکیت کے اندازِ کُہن کا سکّہ دنیا میں نہیں چل سکتا تھا۔ عیسائیت نے جن آئین ودساتیر کو رائج کیا تھا، وہ نظم وضبط اور وحدت ویکجہتی کے بجائے تشتّت وافتراق اور ہلاکت وبربادی کا موجب بن رہے تھے۔ غرضیکہ وہ وقت آچکا تھا جب ہر طرف فساد ہی فساد نظر آتا تھا۔ تہذیب کا وہ بلند وبالا درخت جس کی سرسبز اور شاداب شاخیں کبھی ساری دنیا پر سایہ فگن تھیں اور آرٹ، سائنس اور لٹریچر کے زرّیں ثمرات سے بہرہ یاب ہوچکی تھیں، اب لڑکھڑا رہا تھا۔ عقیدت واحترام کی زندگی

بخش نمی اس کے تنے سے خشک ہوچکی تھی اور وہ اندر تک سے بوسیدہ اور کھوکھلا ہو چکا تھا۔ سلسلۂ حرب و ضرب کے طوفان نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے اور یہ ٹکڑے صرف رسوماتِ پارینہ کے بندھن سے ایک جگہ قائم تھے لیکن ان کے متعلّق ہر وقت خطرہ تھا کہ نہ معلوم کب گر پڑیں۔

اور اس کے بعد وہ کہتا ہے:

کیا ان حالات میں کوئی ایسا جذباتی کلچر کہیں سے پیدا کیا جا سکتا تھا جو نوعِ انسان کو ایک مرتبہ پھر ایک نقطہ پر جمع کر دیتا اور اس طرح تہذیب کو مٹنے سے بچا لیتا؟ اس کلچر کو بالکل نئے انداز کا ہونا چاہئے تھا، اس لئے کہ پرانی رسومات اور آئین وضوابط سب مردہ ہو چکے تھے اور انہی جیسے اور آئین کا مرتب کرنا صدیوں کا کام تھا۔

یہ امر موجبِ حیرت واستعجاب ہے کہ اس قسم کا نیا کلچر سرزمینِ عرب سے پیدا ہوا اور اس وقت پیدا ہوا جبکہ اس کی اشد ضرورت تھی۔

علامہ اقبالؒ نے عالمِ انسانیت کی اس حالت کو اپنے مخصوص انداز میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

بود انساں در جہاں انساں پرست — ناکس و نابود مند و زیر دست
سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش — بند ہا در دست و پا و گردنش
کاہن و پاپا و سلطان و امیر — بہرِ یک نخچیر، صد نخچیر گیر

مفہوم: اس دنیا میں انسان، انسان کی پوجا کیا کرتا تھا۔ وہ مَا، مِٹا ہُوا اور غلامی کی زندگی بسر کرتا تھا۔ ایران اور روم جیسی بڑی سلطنتوں کے بادشاہ (انسانیت کے حق میں) ڈاکو تھے اور انہوں نے اس کے ہاتھ، پاؤں اور گردن کو مضبوطی سے باندھا ہُوا تھا کاہن، مذہبی پیشوا، حکمران اور امیر لشکر وفوج غرض شِکار ایک (انسانیت) اقور شکاری ہزاروں تھے۔ (م۔س۔ا)

محدّث دہلوی شاہؒ ولی اللہ نے اسی ضمن میں کہا تھا:

چونکہ ہمارے نبی اکرمؐ کے زمانے میں اقوام کے اندر معاشی ومعاشرتی فسادات پیدا ہو چکے تھے اور ان کی اقتصادی زندگی سخت خراب ہوچکی تھی اس لئے حضور ﷺ کو ان خرابیوں کے استیصال کے لئے مبعوث فرمایا گیا اور آپؐ کے ہاتھوں رومی اور ایرانی ملوکیتوں کو برباد کرایا (جو ان ناہمواریوں کا سرچشمہ تھیں)

(تفہیماتِ الٰہیہ، جلد اوّل، ص:66)

عالمگیر رسالت:

یوں تو خدا کا ہر رسول اسی قسم کے انقلاب کا داعی ہوتا تھا، لیکن حضرات انبیائے علیہم السلام سابقہ اور حضور نبی اکرم ﷺ میں ایک بنیادی فرق ہے۔ ازمنۂ گذشتہ میں چونکہ آبادیاں محدود ہوتی تھیں اور وسائلِ مواصلات اور ذرائع رسل ورسائل عام نہیں تھے، اس لئے ایک رسول ﷺ کا دائرہ اثر ونفوذ ایک خاص خطۂ زمین تک محدود ہوتا تھا۔ لیکن حضور نبی اکرم ﷺ کی

بعثت ایسے زمانہ میں ہوئی جو عصرِ قدیم اور دورِ حاضرہ کے (درمیان) حدِّ فاصل تھا۔ اب دنیا کی آبادیوں نے محدود نہیں رہنا تھا، انہیں پھیل کر ایک عالمگیر معاشرہ بن جانا تھا۔ اس لئے حضورؐ کی بعثت نہ کسی خاص قوم کے لئے مخصوص تھی نہ کسی خاص خطۂ زمین تک محدود۔ حضور ﷺ تمام نوعِ انسان کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ سورہ الاعراف میں ہے قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (7:158، 3:17، 3:79)۔ اے رسول! تم تمام نوعِ انسان کو مخاطب کر کے کہہ دو کہ میں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ دوسری جگہ ہے۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (34:28) ''اے رسول (ﷺ)! ہم نے تمہیں پُوری کی پُوری انسانیت کے لئے بشیر ونذیر بنا کر بھیجا ہے۔'' اس پُوری کی پُوری انسانیت سے مراد صرف حضورؐ کے زمانہ کا عالمِ انسانیت نہیں تھا بلکہ اس میں قیامت تک آنے والے انسان سب شامل تھے۔ سورۃ الجمعہ میں ہے کہ، ہم نے ان لوگوں کی طرف اپنا رسول بھیجا جن کی طرف رسول نہیں تھا، یہ ان کی طرف بھی رسول تھا وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ؕ (62:3) ''جو ان کے بعد آنے تھے۔'' ظاہر ہے کہ ان کے بعد آنے والوں میں تمام دنیا کے قیامت تک کے انسان شامل تھے۔ یہ وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے جہاں خدا کے متعلق کہا کہ وہ '' رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ '' (1:1) ہے۔ اس کی کتاب کے متعلق کہا کہ وہ ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (38:87) ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے متعلق کہا کہ آپ ﷺ '' رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ '' (21:107) ہیں اور اس کی شہادت یہ کہہ کر دی کہ جو کتاب اس رسول (ﷺ) کی طرف بھیجی گئی ہے وہ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ (6:115) ''ہر طرح سے مکمل ہے، آخری کتاب ہے۔ غیر متبدل ہے اور اس میں کوئی بھی تبدیلی نہیں کر سکتا۔'' یہ اس کتاب کی خصوصیت تھی اور جو انقلاب اس کتاب کی رُو سے برپا ہونا تھا اس کی عالمگیریت کی طرف یہ کہہ کر (اشارہ) کر دیا کہ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (61:9) ''اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ضابطۂ ہدایت اور مبنی برحقیقت نظام دے کر بھیجا تا کہ وہ نظام دیگر تمام نظام ہائے عالم پر غالب آ جائے۔ خواہ یہ بات ان لوگوں پر کتنی ہی گراں کیوں نہ گذرے جو متفرق نظاموں کے تحت رہنا چاہتے ہیں۔ خدائے واحد کے نظامِ واحد کو پسند نہیں کرتے۔''

انقلابِ محمدی ﷺ:

اس انقلاب کی وسعت حدود نا آشنا تھی، لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس کا آغاز بہر حال اس خطہ زمین سے ہونا تھا جس میں حضورؐ کی بعثت ہوئی تھی۔ اس انقلاب سے وہاں کس قسم کی تبدیلی رُونما ہوئی اس کے متعلق بھی ہم غیر مسلم مفکرین کی شہادات پیش کرنا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔ (Pringle Kennedy) ہمارے دور کا ایک مشہور فلاسفر ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> ''چند ہی سال کے عرصہ میں یہ نقشہ کس طرح بدل گیا۔ کس طرح 650ء تک یہ دنیا اس دنیا سے یکسر مختلف ہوگئی جو اس سے پہلے تھی، نوعِ انسانی کی تاریخ میں یہ باب ایک نمایاں خصوصیت کا حامل ہے۔''

(Arabian Society at the time of Muhammad P.18)

کارلائلؔ اپنے مخصوص انداز میں لکھتا ہے:

''عربوں کے لئے یہ انقلاب ایک نئی زندگی تھی جو انہیں تاریکی سے نُور کی طرف لے آئی تھی۔ عرب اس کے ذریعہ پہلی دفعہ زندہ ہوا۔ ایک ایسی قوم جو ابتدائے آفرینش سے گمنامی کے عالم میں ریوڑ چراتی پھرتی تھی، ان کی طرف ایک رسول آیا جو اپنے ساتھ ایک ایسا پیغام لایا جس پر وہ قوم ایمان لے آئی۔ وہ دیکھو! وہی گمنام چرواہے دنیا کی ممتاز ترین قوم بن گئے۔ وہ حقیر قوم ایک عظیم الشان ملت میں تبدیل ہوگئی۔ ایک صدی کے اندر اندر عرب ایک طرف غرناطہ اور دوسری طرف دہلی تک چھا گئے۔ اس کے بعد سینکڑوں برس ہو چکے ہیں کہ یہ اسی شان وشوکت اور درخشندگی وتابندگی سے کرۂ ارض کے ایک حصہ پر مسلّط ہیں (یہ سب ایمان کی حرارت سے ہوا)۔ ایمان بہت بڑی چیز ہے۔ ایمان ہی سے زندگی ملتی ہے۔ جونہی کسی قوم میں ایمان پیدا ہوا، اس قوم کی تاریخ، اعمال میں نتائج اور روح میں بالیدگی پیدا کرنے والی بن گئی۔

''وہ عرب۔۔۔ یہ محمد ﷺ ۔۔۔ اور ایک سو سال کا عرصہ! کیا یہ انقلاب ایسا ہی نہیں جیسے ریت کے کسی سیاہ گمنام ٹیلے پر آسمان سے بجلی کی لہر آ گرے اور وہ ریت کا تودہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک آتش گیر مادے میں تبدیل ہو کر اس طرح بھک سے اُڑ جائے کہ دہلی سے غرناطہ تک اس کے شعلوں کی لپیٹ میں آ جائے؟''

''نوعِ انسانی خشک نیستاں کی طرح ایک شرارہ کے انتظار میں تھی۔ وہ بجلی کا شرارہ اس بطلِ جلیل ﷺ کی صورت میں آسمان سے آیا اور تمام نوعِ انسانی کو شعلہ صفت بنا گیا۔''

(Heroes and Hero Worship. Page:66)

ممتاز تاریخ دان گبنؔ اس باب میں کہتا ہے:

''محمد ﷺ کا مذہب شک وابہام سے بالکل مبرّا ہے اور قرآن، خدا کی توحید کی درخشندہ شہادت، نبی عربی ﷺ نے بتوں، انسانوں اور اجرام سماوی کی پرستش کو اس بصیرت افروز دلیل کی بنا پر ردّ کر دیا کہ جو طلوع ہوتا ہے وہ غروب بھی ہوتا ہے۔ جو پیدا ہوتا ہے، وہ مرتا بھی ہے۔ جس کی بنیاد میں فساد ہے اس کا مآل ہلاکت اور تباہی ہے۔ آپ کے دینی جوش اور ولولہ نے جو یکسر مبنی علی البصیرت تھا، خالقِ کائنات کی صورت میں، اس لاانتہا ذاتِ سرمدی کا اقرار کر کے اسے مرکزِ حمد وستائش قرار دے دیا، جو صورت اور مکان کی جہت سے بلند اور اولاد اور مثیل کی نسبتوں سے بالا تھی۔ وہ ذات جو ہمارے پوشیدہ خیالات تک میں موجود اور خود اپنی ذات سے قائم ہے، اور جس کے سرچشمہ سے عقل واخلاق کے جوہروں کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہ مسلکِ توحید اس قدر بلند ہے کہ ہماری موجودہ استعداد کی وہاں تک رسائی نہیں ہو سکتی۔

جو چیز ہمارے لئے سب سے زیادہ وجہِ حیرت ہے، وہ اسلام کی اس قدر جلد اشاعت نہیں، بلکہ یہ کہ

اس کی تعلیم کس قدر ابدی حقائق پر مبنی ہے۔ وہی سادہ لیکن مکمل نقش جو محمد عربی ﷺ نے مکہ اور مدینہ میں انسانی قلوب پر مسکوک کیا تھا اور جو ان بارہ صدیوں کے انقلاب کے باوجود ہندوستان سے افریقہ تک قرآن کے متبعین کے ہاں محفوظ چلا آتا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے مذہب اور عقیدہ کے مقصود کو عام انسانی حواس وتخیل کی سطح پر اُترنے نہیں دیا۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ، اسلام کا نہایت سادہ اور غیر متبدّل عقیدہ ہے۔ ان کا خدائی تصوّر کبھی بھی مرئی ہستیوں کا شرمندہ نہیں ہوسکا۔ رسول اللہ ﷺ کا درجہ کبھی بشریت کی حد سے تجاوز نہیں کرسکا۔ ان کی زندہ تعلیمات نے ان کے متبعین کے جذباتِ عقیدت کو دین و دانش کے حدود سے باہر نہیں جانے دیا۔ یہ ہے اسلام کی سادہ اور ابدی تعلیم۔

(Gibbon-Decline & Fall of Roman Empire Page: 287 & 352)

اور بریفا کہتا ہے:

''یورپ کی نشاۃِ ثانیہ پندرہویں صدی میں نہیں ہوئی، بلکہ اس وقت ہوئی جب یورپ عربوں کے کلچر سے متاثر ہوا۔ یورپ کی خلقتِ جدیدہ کا گہوارہ اٹلی نہیں، بلکہ اُندلس ہے۔ اِدھر روما کی تہذیب، گرتے گرتے، بربریت کی حد تک پہنچ چکی تھی اور اُدھر دنیائے اسلام (بغداد، قرطبہ، قاہرہ) تہذیب وذہنی تحریکات کے مرکز بن رہے تھے۔ ان ہی شہروں میں وہ نئی زندگی نمودار ہوئی جسے انسانی ارتقاء میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنا تھا۔ جس وقت یہ نئی تہذیب محسوس طور پر سامنے آئی، دنیا حیاتِ نو سے شناسا ہوئی۔۔۔ اگر عرب نہ ہوتے تو یورپ کی تہذیب کا وجود عمل میں نہ آتا۔ ان کے بغیر یہ یقیناً اس خصوصیت کو حاصل نہ کرسکتا تھا، جس نے اسے ارتقائی مراحل میں بلند ترین سطح پر لا کھڑا کیا ہے۔ مغربی کلچر میں کوئی ایسا شعبہ نہیں جس میں عربی ثقافت کا رنگ نہ جھلکتا ہو۔ لیکن ایک شعبہ تو ایسا ہے جس میں یہ اثر بالکل نکھر کر سامنے آجاتا ہے اور یہی وہ شعبہ ہے جو درحقیقت عصرِ حاضر کی حقیقی قوت کا باعث اور اس کی فتوحات کا ذریعہ ہے۔ یعنی علم الاشیاء۔۔۔ سائنس کی روح!۔ ہماری سائنس صرف اسی حد تک عربوں کی رہینِ منّت نہیں کہ انہوں نے ہمیں عجیب وغریب نظریات وانکشافات سے روشناس کرایا۔ نہیں! بلکہ ہماری سائنس کا وجود ہی ان کا شرمندہ احسان ہے۔ اسلام سے پہلے کی دنیا، درحقیقت زمانہ قبل از سائنس (Pre-Scientific Age) ہے۔ پندرہویں صدی تک یورپ انہی علوم وفنون کو اپناتا رہا جو اُسے مسلمانوں نے دیئے تھے، اس پر کوئی اضافہ نہ کرسکا۔۔۔ جب اُندلس میں تہذیب وثقافت نے پھر تاریکیوں کی چادر اوڑھ لی تو یورپ میں وہ جِن نمودار ہوا جسے اُندلس کی سرزمین نے پیدا کیا تھا۔ یورپ کو زندگی (صرف) سائنس نے دی۔ اسلام کے گوناگوں اثرات اس کی حرارت کا موجب ہے۔''

(Briffult - Making of Humanity)

ہم چاہتے تو اس باب میں اس قسم کی بیسیوں اور شہادات بھی پیش کی جاسکتی تھیں لیکن ہم سرِ دست انہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ کیونکہ اس کے بعد ہمیں خود اپنے زمانہ کی طرف آنا ہے تا کہ یہ دیکھا جائے کہ دنیا اس نظام کے احیاء کے لئے کس قدر تڑپ رہی ہے جو سرزمین عرب میں قائم ہوا تھا۔

اس کے بعد؟:

حضور نبی اکرم ﷺ کے ہاتھوں اس عظیم انقلاب کی بنیاد رکھی گئی اور حضور ﷺ کے سچے جانشینوں نے اس عمارت کو استوار کیا۔ ان کے بعد آنے والوں نے اپنی مساعی کا رُخ دوسری طرف موڑ دیا، جس سے دین، مذہب میں بدل گیا اور اس انقلاب کی وہ شکل بھی باقی نہ رہی۔ میں اس حقیقت کو بار بار وضاحت سے بیان کر چکا ہوں کہ نظامِ خداوندی جن قوانین کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے وہ ازلی اور ابدی ہیں اور فطرت کے قوانین کی طرح ہر وقت کارفرما رہتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ جس وقت کوئی ایسی جماعت پیدا ہوتی ہے جو اس نظام کو عملاً متشکل کرنے کا تہیہ کرتی ہے، وہ قوانین چند دنوں میں محسوس نظام کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن اگر ایسی جماعت باقی نہیں رہتی تو پھر وہ اپنی رفتار سے غیر محسوس طور پر آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں، لیکن یہ رفتار بڑی سست ہوتی ہے۔ قرآن کے بیان کے مطابق خدا کا ایک ایک دن ہزار ہزار بلکہ پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے۔ ان قوانین کے اپنے رفتار سے کارفرما رہنے کا انداز یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی فکر اور عقل کی رُو سے اپنے لئے ایک نظامِ زندگی متعین اور متشکل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اس کے نتائج بتاتے ہیں کہ وہ نظام وجہ اطمینان نہیں ہوسکتا۔ پھر وہ اسے چھوڑتا ہے اور کوئی دوسرا نظام وضع کرتا ہے۔ انہی تجرباتی طریقوں سے وہ آگے بڑھتا جاتا ہے اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جب وہ کسی نظام کو کسی حد تک بھی اپنے لئے قابلِ اطمینان پاتا ہے تو اس نظام کا رُخ اسی منزل کی طرف ہوتا ہے جسے قرآنِ کریم نے عالمگیر انسانیت کے لئے تجویز کیا ہے۔ اس وقت دنیا میں ایک ہمہ گیر شورش برپا ہے۔ انسانوں نے اپنے تجرباتی طریق کی رُو سے صدیوں کے منازل طے کرنے کے بعد اس وقت جو نظام وضع کئے ہیں وہ انہیں قابلِ اطمینان نہیں پا رہا اور کسی ایسے نظام کے لئے تڑپ رہا ہے جو اس کے لئے وجہ سکون اور باعثِ فلاح و فوز بن سکے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ اس وقت دنیا میں جو اہم بنیادی نظام مروّج ہیں، کیا انہیں اقوامِ عالم نے اطمینان بخش پایا ہے اور اگر ایسا نہیں تو ان کے ذہن میں اس نظام کا تصوّر کس قسم کا ہے جو ان کے نزدیک وجہ طمانیت بن سکتا ہے۔

نظامِ حکومت:

جو نظام قرآنِ کریم کی رُو سے حضور نبی اکرم ﷺ کے مقدس ہاتھوں متشکل ہوا تھا اس کی بنیاد اس اہم حقیقت پر تھی کہ دنیا میں کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کر سکے۔ خواہ وہ حکومت لاقانونیت کی رُو سے ہو یا انسانوں کے خود وضع کردہ قوانین کے مطابق۔ وہ ان دونوں شکلوں کو غلامی سے تعبیر کرتا ہے۔ اس غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لئے اس نے اعلان کیا کہ:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ(3:79)

''کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں خواہ اسے ضابطۂ قوانین یا زمامِ اقتدار حتیٰ کہ نبوّت بھی کیوں نہ حاصل ہو کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں میرے محکوم، مطیع اور فرماں بردار بن جاؤ۔ اسے یہی کہنا چاہئے کہ تمہیں اس کتابِ خداوندی کے مطابق، جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو، اور اس پر غور وفکر کرتے رہتے ہو، خدا کے محکوم بن جانا چاہئے۔''

اس آیۂ جلیلہ میں نظری طور پر ہی نہیں کہا گیا کہ تم خدا کے محکوم بن جاؤ، اس کا عملی طریقہ بھی بتا دیا اور وہ یہ کہ خدا کے محکوم بننے سے مُراد یہ ہے کہ تم اس کی کتاب کے مطابق حکومت قائم کرو (دیکھیے 5:44، 5:48)۔ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم کرنے سے مُراد یہ ہے کہ انسانوں کو۔۔۔ خواہ وہ ایک فرد ہو یا افراد کی جماعت۔۔۔ قانون سازی کا حق حاصل نہیں۔ حکومت کا فریضہ قوانینِ خداوندی کو نافذ کرنا ہے نہ کہ خود قوانین وضع کرنا۔ یہ تھا وہ عملی طریق جس سے قرآنِ کریم نے نوعِ انسان کو صحیح آزادی کا منشور دیا۔ صدرِ اوّل کے بعد یہ نظام نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور انسانوں نے عقل کے تجرباتی طریق کی رُو سے اپنے لئے نظامِ حکومت خود وضع کرنا شروع کر دیا۔ صدیوں کے تجربات کے بعد اب وہ اس نظام تک پہنچے ہیں جسے سیکولر نظام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس کا عملی ذریعہ مغرب کا نظامِ جمہوریت ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ نظام اطمینان بخش ثابت ہوا ہے۔ اس کے لئے خود مغربی مفکرین کی آراء ملاحظہ فرمائیے۔ (مثلاً فرانسیسی مفکر Rene- Guinn) لکھتا ہے:

جمہوری نظام:

اگر لفظ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ لوگ اپنی حکومت آپ قائم کریں تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ہے جس کا وجود ناممکنات سے ہے اور جو نہ کبھی پہلے وجود میں آئی ہے اور نہ آج کہیں موجود ہے۔ ایسا کہنا ہی جمع بین النقیضین ہے کہ ایک ہی قوم بیک وقت حاکم بھی ہو اور محکوم بھی۔۔۔ ہماری موجودہ دنیا میں جو لوگ کسی نہ کسی طرح قوت اور اقتدار حاصل کر لیتے ہیں، ان کی سب سے بڑی قابلیت اس میں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں یہ عقیدہ قائم کر دیں کہ ان پر کوئی حاکم نہیں بلکہ وہ خود اپنے آپ حاکم ہیں۔ عام رائے دہندگی کا اصول اسی فریب دہی کی خاطر وضع کیا گیا ہے۔ اس اصول کی رُو سے سمجھا یہ جاتا ہے کہ قانون اکثریت کی مرضی سے وضع ہوتا ہے اور اس حقیقت کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے کہ اکثریت کی یہ مرضی ایک ایسی شے ہے جسے نہایت آسانی سے خاص رُخ پر لگایا بھی جا سکتا ہے اور بدلا بھی جا سکتا ہے۔

(Crisis of the Modern World)

جمہوری نظام کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ اکثریت کے فیصلے حق پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس باب میں پروفیسر ایلفر ڈ کوبن

لکھتا ہے کہ:

''یہ اصول بنیادی طور پر غلط ہے۔ اگر کسی غلط بات کو لاکھ آدمی بھی صحیح کہہ دیں تو وہ صحیح نہیں ہوسکتی۔ فیصلہ وہی صحیح ہوسکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو، نہ وہ کہ جسے زیادہ لوگ صحیح کہنا شروع کردیں۔''

پروفیسر کوبنؔ نے کہا ہے کہ فیصلہ وہی صحیح ہوسکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو۔ سوال یہ ہے کہ اس کا معیار کیا ہے کہ فلاں فیصلہ درحقیقت صحیح ہے؟ اس کے لئے خود مغربی مفکرین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انسانوں کو قانون سازی کا حق حاصل ہی نہیں ہونا چاہئے کیونکہ ان کے فیصلے ہر حالت میں صحیح نہیں ہوسکتے۔ فرانسیسی مفکر (Betrand De Jouvenel) نے ایک مشہور کتاب لکھی ہے (Sovereignty) وہ اس میں کہتا ہے کہ:

''بہ ادنیٰ تعمق یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ اگر آپ ایک دفعہ اس اصول کو تسلیم کرلیں کہ انسانی مرضی اور ارادے کو اقتدارِ مطلق حاصل ہوسکتا ہے تو اس کے بعد جو نظامِ حکومت بھی قائم ہوں گے، حقیقت کے اعتبار سے وہ سب ایک جیسے ہوں گے۔ نظامِ ملوکیت اور جمہوری نظام، بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن اس اصول کی رُو سے دونوں کا شعوری قالب ایک ہی ہوتا ہے۔ جس کے ہاتھ میں اقتدار ہو، یہ اصول اسے یکساں حقِ مطلق العنانی عطا کردیتا ہے۔''(ص:199)

اسی حقیقت کو امریکی ماہرِ آئین ایڈورڈؔ کارون اپنی کتاب (The Higher Law) میں بڑی وضاحت سے سامنے لاتا ہے۔ وہ اس میں مشہور مقنن (Cicero) کے الفاظ نقل کرتا ہے:

حقیقی قانون، مبنی برحکمت اور فطرت سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ یہ فضا میں ہر جگہ پھیلا ہوا، غیر متبدّل اور ابدی ہوتا ہے۔ یہ قانون معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے روکتا ہے۔ یہ مملکت کا مقدس فریضہ ہے کہ کوئی ایسا قانون نافذ نہ کرے جو اس قانون کے خلاف ہو۔ اسے اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ اس میں کسی قسم کی ترمیم کرے نہ ہی وہ اسے منسوخ کرسکتا ہے۔ نہ ہی ہماری پارلیمان نہ ہی سینٹ کو اس کا اختیار ہے کہ وہ لوگوں کو اس قانون کی قید سے آزاد کردے۔۔۔ نہ ہی اس قانون کی کیفیت یہ ہے کہ روما کے لئے الگ قانون ہو اور ایتھنز کے لئے الگ۔ ایک قانون آج ہو اور دوسرا کل۔ یہ ایک ازلی، غیر متبدّل قانون ہے جو ابدی طور پر تمام اقوام کو اپنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہے۔(ص:10)

یہ اقدار وقوانین کہاں سے ملیں گے اس کے متعلق ہمارے دور کا سب سے بڑا سائنس دان آئن سٹائن کہتا ہے کہ:

یہ اقدار تجربات کے بعد وضع نہیں کی جاسکتیں۔ یہ مقتدر ہستیوں کی وساطت سے بذریعہ وحی ملتی ہیں۔ ان کی بنیاد عقلِ انسانی پر نہیں ہوتی لیکن وہ تجربہ کی کسوٹی پر بالکل پوری اُترتی ہیں۔ اس لئے کہ صداقت کہتے ہی اسے ہیں جو تجربہ سے درست ثابت ہو۔

نظامِ عدل:

حکومت کا بنیادی منصب، نظامِ عدل کا قیام ہے۔ قانون کی دنیا میں عدل سے مُراد ہوتا ہے مروجہ قوانین کے مطابق فیصلے کرنا۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اگر وہ قوانین ہی حق پر مبنی نہ ہوں تو ان کے مطابق فیصلوں کو عدل کیسے کہا جائے گا؟ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ خود اقوامِ مغرب کے مفکرین کے نزدیک انسانوں کو قوانین وضع کرنے کا حق حاصل نہیں ہوسکتا۔ بنابریں انسانوں کے وضع کردہ قوانین کے مطابق فیصلے عدل کہلا ہی نہیں سکتے۔ صرف قوانینِ خداوندی کے مطابق فیصلے عدل کہلا سکتے ہیں۔ (Emil Brunner) ہمارے دور کا فلسفۂ قانون کا بہت بڑا ماہر ہے۔ وہ اس باب میں لکھتا ہے:

> جو شخص فی الواقعہ سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ فلاں بات مبنی بر عدل اور فلاں ظلم پر مبنی ہے، وہ درحقیقت کہتا یہ ہے کہ عدل اور ظلم ماپنے کا ایک ایسا پیمانہ ہے جو تمام انسانی قوانین، معاہدات، رسوم ورواج سے ماوراء ہے۔ وہ ایک ایسا معیار ہے جس سے تمام انسانی معیار ماپے اور پرکھے جاسکتے ہیں۔ یا تو اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ عدل کے لئے اس قسم کا مطلق، الوہیاتی معیار موجود ہے، ورنہ اس لفظ کا مفہوم انفرادی بن کررہ جائے گا جو ایک کے نزدیک قابلِ قبول ہوگا اور دوسرے کے نزدیک ناقابلِ تسلیم۔ عدل کے لفظ سے مفہوم یا تو خداوندی فیصلہ ہوگا جس کے ساتھ حقِ مطلق (الحق) ہونے کی تقدیس شامل ہوگی اور یا پھر یہ محض جھوٹے نگوں کی میناکاری اور ملمع سازی ہوگی۔ (Justice and the Social Order)

آپ نے غور فرمایا کہ عصرِ حاضر کا انسان اپنے وضع کردہ نظامِ حکومت کے ہاتھوں کس قدر تنگ آچکا ہے۔ اس کے نزدیک وہی نظامِ حکومت موجب اطمینان اور مبنی بر صداقت کہلا سکتا ہے جو قوانین خداوندی کے نافذ کرنے کا ذریعہ ہو۔ وہ ان قوانین کی تلاش میں بُری طرح سرگرداں پھر رہا ہے۔

نیشنلزم:

قرآنِ کریم نے آج سے چودہ سوال پہلے یہ اعلان کیا کہ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً (2:213) ''تمام نوعِ انسان ایک عالمگیر برادری ہے، اس لئے اسے مختلف قبیلوں، نسلوں اور قوموں میں تقسیم کر دینا جہنم کی تباہی لانے کے مترادف ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے اس اصول کے مطابق ایسی اُمت تشکیل فرمائی جو رنگ، نسل، زبان، وطن کی، انسانوں کی خودساختہ حدود وامتیازات کو مٹا کر نظریہ کی وحدت کی بنیادوں پر قائم ہوئی۔ یہی انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کی مبنی برحقیقت شکل تھی اور اس کا نتیجہ وہ جنّت جو یک رنگ وہم آہنگ انسانوں کے اجتماع سے وجود میں آتی ہے۔ لوگوں نے اس تصوّر کو فراموش کر کے نیشنلزم کا نظریہ وضع کیا۔ اسے عمل میں آئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن اس کے تباہ کن نتائج کے ہاتھوں مغربی مفکرین چیخ اُٹھے ہیں۔ (مثلاً) پروفیسر میسنؔ اپنی کتاب (Creative Freedom) میں لکھتا ہے:

> جنگ کی بنیاد نیشنلزم ہے، جس طرح افراد میں باہمی تنازعہ کی بنیاد جذبۂ انانیت ہوتا ہے۔ ارتقائے

جنگ کی ساری تاریخ کا سراغ اس بنیاد سے لگ سکتا ہے۔

برٹرینڈ رسل کہتا ہے کہ:

ہمارے زمانے میں جو چیز معاشرتی روابط کو قومی حدود سے آگے بڑھانے میں مانع ہے، وہ نیشنلزم ہے۔ اس لئے نیشنلزم نوعِ انسان کی تباہی کے لیے سب سے بڑی قوت ہے، (پھر تماشہ یہ کہ) ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ دوسرے ملکوں کی نیشنلزم بڑی خراب چیز ہے۔ لیکن اس کے اپنے وطن کی نیشنلزم بہت اچھی ہے۔

(The Hopes for a Changing World)

وہ اس کے بجائے کس قسم کا نظام چاہتے ہیں اس کے متعلق بھی انہوں نے اب بڑی وضاحت سے کہنا اور لکھنا شروع کر دیا ہے۔ مثلاً کیتھولک چرچ کا راندۂ درگاہ پادری (Tielard - de - Chardin) جس کی کتابوں کو کلیسا نے اس کی زندگی میں شائع نہیں ہونے دیا تھا، اپنی کتاب (Building of The Earth) میں لکھتا ہے:

اب اقوام کا زمانہ گزر چکا ہے۔ اگر ہم نے ہلاکت سے بچنا ہے تو کرنے کا کام صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنے قدیم تعصّبات کو ختم کر دیں اور (مختلف ملکوں اور خطوں کی حدود سے آگے بڑھ کر) خود کرۂ ارض کی تعمیرِ نو کا انتظام کریں۔ انسان کو اس کی موجودہ پستی سے نکال کر بلندیوں کی طرف لے جانے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے دعوتِ انسانیت کا راستہ۔ اب شعورِ انسانی کے لئے ضروری ہے کہ وہ خاندان، وطن اور نسل کی تنگ ناؤں سے آگے بڑھ کر پوری نوعِ انسانی کو اپنی آغوش میں لے لے۔

کیلیفورنیا یونیورسٹی کا پروفیسر (Hugh Miller) اپنی کتاب میں جس کا نام ہی اس نے (The Community of Man) رکھا ہے، لکھتا ہے:

تہذیب کا فریضہ ہے کہ وہ پھر سے اس انسانی برادری کا احیاء کرے جو انسانی زندگی کی ابتداء میں موجود تھی، لیکن جو بعد میں عارضی طور پر خاندانوں، قبیلوں اور نسلوں میں بٹ گئی۔ تہذیب کہا ہی اسے جا سکتا ہے جو انسانوں کو باہم دِگر جوڑ دے۔ انسانی ارتقاء کا اگلا قدم ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل ہونا چاہئے جو تمام نوعِ انسان پر مشتمل ہو۔

(Gunner Myrdal) سویڈن کا مشہور ماہر اقتصادیات ہے وہ کہتا ہے کہ:

یہ حقیقت ہے کہ ہمارے یہ بلند مقاصد اسی صورت میں حاصل ہو سکیں گے جب ایک ایسی دنیا وجود میں آ جائے جس میں نہ کرۂ ارض پر کھینچی ہوئی ممالک کی لکیریں ہوں اور نہ ہی قوموں کے خود وضع کردہ حدود۔ یہ دنیا وہ ہو گی جہاں انسان جہاں جی چاہے، آزادانہ چلے پھرے، رہے سہے اور ہر جگہ یکساں شرائط پر اپنے لئے حصولِ مسرّت کر سکے۔ سیاسی طور پر اس سے مُراد تمام دنیا کی واحد حکومت ہو گی اور جمہوری طور پر یہ تمام انسانوں کے باہمی مشورہ سے اپنا کاروبار سرانجام دے گی۔

اس کے بعد یہ مفکر لکھتا ہے:

ہم اپنی روح کے مذہبی نشیمن میں کسی ایسی ہی حسین دُنیا کا تصوّر محسوس کرتے ہیں جس میں کامل ہم آہنگی اور یکجہتی ہو۔

مشہور امریکی مفکر (Lewis Mumford) لکھتا ہے کہ تہذیب درحقیقت اس عملِ پیہم اور غیر مختتم کا نام ہے جو ایک دنیا، اور اس میں بسنے والی ایک انسانی برادری، کی تشکیل کرے۔ وہ آگے چل کر لکھتا ہے:

اگر ہم نے اس عملی وحدت کو مزید التوا میں رکھا تو اس کا نتیجہ عالمگیر تباہی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ مغربی انداز معاشرت کا کھیل کھیلا جاچکا ہے اور یہ تمدّن بری طرح ناکام ثابت ہوا ہے۔۔۔ اب دنیا کو ایک ایسے بطلِ جلیل کی ضرورت ہے جو اس کلچر اور تاریخ کی تمام حدود کو توڑ دے جنہوں نے انسان کو اپنے اندر قید کر رکھا ہے اور اس طرح اس کی نشوونما کے راستے میں بری طرح حائل ہو رہی ہیں، اس بطلِ جلیل کی ضرورت، جو کاروانِ انسانیت کو موجودہ تباہی کے ویرانوں سے نکال کر، وحدتِ انسانیت کے عالمگیر نظام کی طرف لے جائے۔ (Transformation of Man)

اگر ان مفکرین کے سامنے اسلام کی صحیح تاریخ ہوتی تو انہیں نظر آجاتا کہ وہ بطلِ جلیل جو کاروانِ انسانیت کو موجودہ تباہی کے ویرانوں سے نکال کر وحدتِ انسانیت کے عالمگیر نظام کی طرف لے جاسکتا ہے، چودہ سو سال ہوئے نبی آخر الزماں ﷺ کی شکل میں دنیا میں آیا تھا اور اس نے اس وحدت کو عملاً قائم کر کے دکھا دیا تھا۔ وہ بطلِ جلیل ﷺ آج اپنے انسانی پیکر میں دنیا میں موجود نہیں لیکن وہ ضابطۂ حیات، جس کے مطابق اس نے اس وحدت کو قائم کیا تھا لفظاً لفظاً دنیا میں موجود ہے اور پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اگر تم عالمگیر انسانیت کی وحدت چاہتے ہو تو میری طرف آؤ۔

معاشی نظام:

ہمارے دور کو، دورِ اقتصادیات (Age of Economics) کہا جاتا ہے۔ اس دور میں انسان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ بتایا جاتا ہے کہ اس نے کمیونزم یا سوشلزم جیسا اقتصادی نظام وضع کیا ہے۔ اس نظام کے اسقام ونقائص کے متعلق میں اتنا کچھ لکھ چکا ہوں کہ اس وقت اس کے دہرانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ طلوع اسلام کنونشن منعقدہ اکتوبر 1975ء میں میرے ایک خطاب کا عنوان تھا ''جہاں مارکس ناکام رہ گیا اس سے آگے''۔ اس میں مَیں نے بڑی وضاحت سے بتایا ہے کہ خود مارکسؔ نے اپنے تصوّر کے نظام کے عملاً متشکل کرنے کے لئے کس طرح اپنے عجز کا اظہار کیا اور اس کے بعد میں نے یہ لکھا ہے کہ اس کے تصوّر کا نظام، حضور نبی اکرم ﷺ نے کس طرح متشکل کر کے دکھا دیا تھا اور وہ آج بھی قرآن کی روشنی میں کس طرح قائم کیا جاسکتا ہے۔ میں اس وقت صرف ایک نکتہ پیش کرنے پر اکتفا کروں گا اور وہ یہ کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے نظامِ سرمایہ داری کے علمبرداروں کو واشگاف الفاظ میں یہ وارننگ دی تھی کہ اگر تم نے اس نظام کو نہ بدلا تو ایک وقت آئے گا

جب یہ پسماندہ، مفلس، نادار، محنت کش تنگ آ کر تمہارے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں گے اور اپنے ساتھ تمہیں بھی لے ڈوبیں گے۔اسے حضور ﷺ نے ایک مثال کے ذریعہ واضح کیا تھا۔آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

کچھ لوگ ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ان میں سے کچھ اُوپر کے حصے میں پہنچ گئے اور کچھ نچلے حصہ میں رہے۔جو نچلے حصہ میں تھے وہ پانی لینے کے لئے اُوپر گئے تو اُوپر والوں نے انہیں یہ کہہ کر پانی لینے سے روک دیا کہ اس سے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔نیچے والوں نے کہا کہ بہت اچھا، ہم نیچے کشتی میں سوراخ کر کے پانی لے لیں گے۔اب اگر نیچے والوں کو، پانی دے کر اس سے نہ روکا گیا تو ظاہر ہے کہ نیچے اور اُوپر والے سب غرق ہوجائیں گے۔اگر انہیں پانی دے کر اس سے روک دیا جائے تو سب بچ جائیں گے۔(ترمذی)

حضورؐ نے سرمایہ داروں کو یہ وارننگ چودہ سو سال پیشتر دی تھی۔آپ دیکھئے کہ آج یہ کس طرح حرفاً حرفاً صحیح ثابت ہو رہی ہے۔امریکہ سے شائع ہونے والے شہرہ آفاق مجلہ (Time) نے اپنی 22 دسمبر 1975ء کی اشاعت میں ایک مبسوط مقالہ شائع کیا جس کا عنوان تھا۔''کرۂ ارض کا ایک نیا تصادم''۔اس میں بتایا گیا ہے کہ اس وقت دنیا کی حالت یہ ہے کہ اس کے قریب 75 کروڑ باشندے ساری دنیا کے ذخائر کو غصب اور ہضم کر کے بیٹھ گئے ہیں اور اس زمین کی قریب ایک سو مملکتوں میں بسنے والے دو ارب باشندے ہر وقت موت کے سائے تلے سسکیاں لے رہے ہیں۔اس میں کہا گیا ہے کہ یہ تو اس وقت کی حالت ہے۔لیکن جب ہم اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں کہ دنیا میں ہر روز قریب بیس لاکھ انسانوں کا اضافہ ہو رہا ہے تو سوچئے کہ چند سالوں کے بعد یہاں کس قسم کی قیامت برپا ہوجائے گی۔اس قیامتِ صغریٰ کی کیفیات کو اس نے صرف چار الفاظ میں سمٹا کر رکھ دیا ہے جب کہا ہے کہ یہ مسئلہ نسلِ انسانی کے لئے ''ٹائم بم'' کی حیثیت رکھتا ہے۔دیر صرف مہلت کے وقفہ کی ہے۔جب یہ اپنے وقت پر پھٹا تو یہ پوری نسلِ انسانی کو تباہ کر کے رکھ دے گا۔اسی آنے والی تباہی کے پیش نظر پچھلے دنوں ستّر کے قریب ترقی پذیر (Developing) ممالک کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔فلپائن کا پریذیڈنٹ اس کا چیئرمین تھا۔اس نے اپنے خطبۂ صدارت میں ترقی یافتہ (Developed) مملکتوں کو وارننگ دی کہ اگر تم ان پسماندہ ممالک کو جلد از جلد اپنے ہمدوش نہ لے آئے تو یہ خود تو تباہ ہوں گے ہی، لیکن اپنے ساتھ تم سب کو بھی تباہ کر کے رکھ دیں گے۔

آپ غور کیجئے عزیزانِ من! کہ وہ تباہی جس کے متعلق نوعِ انسان کے محسنِ اعظم ﷺ نے چودہ سو سال پہلے وارننگ دی تھی، کس قدر حقیقت بن کر سامنے آ رہی ہے۔اس تباہی سے بچنے کے لئے انسانی فکر نے سوشلزم کا نظام وضع کیا تھا۔اس نظام کی کیفیت یہ ہے کہ ''اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے'' وہ ابھی چار قدم بھی نہ چلنے پایا تھا کہ لڑکھڑانے لگ گیا۔روس میں تو وہ ناکام ہوچکا ہے۔اسی ہفتہ خبر آئی ہے کہ وہاں کا نظامِ زراعت اس بُری طرح ناکام ہو رہا ہے کہ وہاں کی مرکزی کمیٹی نے جھنجھلا کر وزیر زراعت کو الگ کر دیا ہے اور ایسا دوسری مرتبہ کرنا پڑا ہے۔چین کے متعلق میں نے کچھ عرصہ پہلے کہا تھا کہ اس کی ترقی کا راز ماؤزے تنگ کی شخصیت ہے۔اس کے بعد آپ دیکھئے گا کہ اس کا بھی کس طرح شیرازہ بکھر جاتا ہے۔وہاں یہ

انتشار چواین لائی کی وفات کے ساتھ ہی شروع ہو گیا ہے حالانکہ ماوزے تنگ ابھی زندہ ہے۔ عزیزان من! جو نظام بھی شخصیات کے سہارے قائم ہوتا ہے اس میں اپنے پاؤں پر کھڑا رہنے کی سکت نہیں ہوتی۔ نظام وہی قائم رہ سکتا ہے جو غیر متبدل اقدار کی محکم بنیادوں پر استوار ہو۔

مذاہب عالم:

دنیا کے مختلف مذاہب کے علمبردار پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اس وقت دنیا جس جہنم میں گرفتار ہے اس کہ وجہ یہ ہے کہ ہماری نئی نسلیں مذہب سے بیگانہ ہو رہی ہیں۔ مذہب کے ان علمبرداروں میں خود ہم مسلمان بھی شامل ہیں کیونکہ ہمارے ہاں بھی وہ دین موجود نہیں جسے خدا نے مقرر کیا اور حضور نبی اکرم ﷺ نے قائم کر کے دکھایا تھا۔ ہمارے ہاں بھی اسلام بہ حیثیت ایک مذہب ہی کے رائج ہے۔ آج مذاہب کی کیا کیفیت ہو چکی ہے، اس کا نقشہ پروفیسر (Hocking) نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:

> یہ تمام مذاہب ٹوٹی ہوئی کشتیاں ہیں (جنہیں حوادثِ زمانہ کے طوفانوں نے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ساحل پر پھینک دیا ہے) یہ سب اپنے اپنے تقدس کی چادروں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ اطمینان خویش نے (جو درحقیقت فریبِ نفس کا دوسرا نام ہے) ان کے متبعین کی آنکھوں میں دھول جھونک رکھی ہے۔ (جس کی وجہ سے انہیں حقیقت نظر ہی نہیں آسکتی) ان کے عقاید و نظریات کے زنگ نے ان کے افکار و اعمال کے قبضوں کو اس قدر جام کر دیا ہے کہ ان میں اب حرکت کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔ یہ لوگ قدامت پرستوں کے کوڑوں سے اس قدر ڈرے سہمے رہتے ہیں کہ ان میں بہت کم ایسے ہیں جو سمجھ اور سوچ سے کام لینے کی جرأت کر سکیں۔ (Living Religions and a World Faith)

دنیا جس طرح اپنے وضع کردہ نظام ہائے حیات سے تنگ آچکی ہے، اسی طرح موجودہ مذاہب سے بھی مایوس ہو چکی ہے۔ کاغذ کے پھولوں سے کوئی کب تک اپنا جی بہلاتا رہے؟ بایں ہمہ وہ اپنی نجات کا ذریعہ مذہب ہی سمجھتی ہے۔ اس کے لئے انہیں کس قسم کے مذہب کی تلاش ہے، اس کا تصوّر امریکہ کے ممتاز ماہرِ نفسیات (Erich Fromm) نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے وہ کہتا ہے، کہ وہ مذہب۔۔۔

> انسان کی ارتقائی منازل کا ساتھ دے گا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ عالمگیر ہوگا اور منتشر انسانیت کو ایک وحدت میں منسلک کر دے گا۔ جو مشرق و مغرب کی تمام تعلیمات کا مہیمن ہوگا۔ وہ عقل و بصیرت پر مبنی ایسا قابلِ عمل ضابطۂ حیات دے گا جو علومِ سائنس سے ہم آہنگ ہو۔ وہ انسان کو اس قابل بنا دے گا کہ وہ خارجی کائنات اور خود اپنی ذات کے ساتھ ہم آہنگ رہ سکے۔ اسی نظام کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ نوعِ انسان کا مذہب بن سکے۔ (The Sane Society)

چونکہ اہلِ مغرب کے ہاں دین کا تصوّر نہیں، اس لئے ان کی زبان میں دین کی قرآنی اصطلاح کے ترجمہ کے لئے بھی کوئی

موزوں لفظ نہیں ہے۔ جو کچھ میں نے پیش کیا ہے اس سے واضح ہے کہ مغرب کے دانشوروں کو ''دین'' کی تلاش ہے، مذہب کی نہیں (وہ تو پہلے ہی مذہب گزیدہ ہیں اور ویسے مذہب کا بنجارہ خود اپنا ٹھاٹھ باٹھ سمیٹ کر رخصت ہونے کے لئے تیار بیٹھا ہے۔ یہ جو اس وقت اس کا دھوم دھڑکا سنائی دے رہا ہے، وہ رقصِ بسمل سے زیادہ کچھ نہیں) لیکن اپنی زبان کی کوتاہ دامنی کی وجہ سے وہ اسے (Religion) ہی سے موسوم کرتے ہیں۔ دوسری طرف چونکہ خود ہمارے ہاں بھی دین کا تصور نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے، اس لئے ہم بھی اسلام کو ایک مذہب ہی کی حیثیت سے سمجھتے اور اسی حیثیت سے اسے دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

مناظرے اور مباحثے:

چنانچہ ہم نے اسلام کی سب سے بڑی خدمت اسی کو سمجھ رکھا ہے کہ دیگر اہلِ مذاہب کے ساتھ مناظروں اور مباحثوں کے ذریعے اسلام کی افضلیت ثابت کر دی جائے اور اپنی ان فتح مندیوں پر جشن و مسرت منائے جائیں۔ عام لوگ تو ایک طرف رہے، ہمارے ہاں ایک شخص۔۔۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے مامور من اللہ ہونے کا دعویٰ کیا اور اس ماموریت کا مقصد یہ بتایا کہ وہ آریوں اور عیسائیوں سے مباحثے کے ذریعے اسلام کی افضلیت ثابت کرے گا۔ عیسائی پادریوں کو شکست دینے کے لئے اس نے نظریہ یہ پیش کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام وفات پا چکے ہیں۔ اپنے اس کارنامے کو اس نے کسرِ صلیب (صلیب توڑ دینے) سے تعبیر کیا۔ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ایک طرف وہ کاسرِ صلیب ہونے کے مُدعی تھے اور دوسری طرف اسی صلیب کی محافظ، سلطنت برطانیہ کی اطاعت کو مسلمانوں کا مذہبی فریضہ قرار دیتے تھے۔ وہ اپنی ان ظفر مندیوں کا ڈنکا بجاتے، دنیا سے رخصت ہو گئے اور اس کے چند ہی سال بعد پہلی جنگِ عظیم میں صلیب پرستوں نے مسلمانوں کی رہی سہی قوت اور حشمت کا بھی تار و پود بکھیر کر رکھ دیا۔ علامہ اقبالؒ نے اُمتِ مسلمہ کو مذہب پرستی کے اس مقدس فریب سے نجات دلانے کے لئے پاکستان کی آزاد مملکت کا تصوّر پیش کیا تھا تاکہ اس میں پھر سے اسلام کو ایک دین (نظامِ حیات) کی حیثیت سے پیش کر کے، اقوامِ عالم کے اختیار کردہ دیگر نظاموں پر اس کی افضلیت ثابت کر دی جائے۔

مملکتِ پاکستان میں مذہبیت:

لیکن واحسرتا کہ ان کے اس خواب کو مذہبی پیشوائیت، سرمایہ داری اور ہماری حکمرانوں کی ہوسِ اقتدار نے خوابِ پریشاں کر کے رکھ دیا اور دین کے احیاء کے بجائے یہاں مذہب نے اپنا جال اور بھی شدت اور وسعت سے پھیلا دیا۔ حتیٰ کہ اب یہ پھندے اپنی انتہا کو پہنچ رہے ہیں۔ مذہب کا مقصود انفرادی جذبات کی تسکین ہوتا ہے جسے ''ثواب'' کے غلط مفہوم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مذہب کس طرح جذبات کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتا ہے، اس کی تازہ ترین مثالیں ہمیں دو ایک حالیہ واقعات سے ملتی ہیں۔ اگلے دنوں پاکستان میں مسجدِ نبوی ﷺ کے امام تشریف لائے۔ انہوں نے لاہور کی بادشاہی مسجد میں نماز جمعہ پڑھائی تو کم از کم پانچ لاکھ افراد نے ان کی اقتداء میں نماز ادا کی۔ کہا جاتا ہے کہ تاریخ میں جمعہ کی نماز کا اتنا بڑا اجتماع اور کہیں نہیں ملتا۔ یہ ہے بھی قابلِ فہم، حضور نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس و اطہر سے ہماری عقیدت ہی نہیں، محبت کا تقاضا ہے

کہ جس چیز کی بھی حضور ﷺ کی طرف کسی انداز سے نسبت ہو، وہ ہمارے نزدیک محبوب اور محترم بن جائے۔ ہم تو مکّہ اور مدینہ طیبہ کی کھجوروں کی گھٹلیوں کو بھی یونہی نہیں پھینک دیتے۔ انہیں بھی زمین میں دفن کردیتے ہیں کہ پامالی سے ان کی بے حرمتی نہ ہو۔ مسجدِ نبوی ﷺ کے یہ امام مسلکِ اہل حدیث کے پابند ہیں اور اس باب میں نجدی آل سعود کی شدّت کا سب کو علم ہے۔ ان کے عقیدہ کی رُو سے مزارات پر گنبد اور قبّے تعمیر کرنا تو ایک طرف، وہ زمین سے ذرا سی اُٹھی ہوئی پختہ قبر کو بھی بدعت قرار دیتے ہیں۔ ان کے اسی مسلک کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے جنت البقیع میں صحابہ کبار رضی اللہ عنہم تک کے مزارات کو زمین کے ساتھ ہموار کردیا۔ ان امام صاحب نے تو معلوم نہیں اس باب میں کچھ فرمایا تھا یا نہیں، ان کے بعد مسجد حرام (کعبہ) کے امام تشریف لائے تو انہوں نے اسی بادشاہی مسجد میں اپنے خطبہ جمعہ میں قبروں کو پوجنے یا ان سے کچھ مانگنے کے رجحانات کو سراسر کفر قرار دیا۔ (نوائے وقت، لاہور، 6 مارچ 1976ء) بہر حال میں کہہ یہ رہا تھا کہ اس پانچ لاکھ کے مجمع نے اس مسلک کے پابند امام کے پیچھے نماز ادا کرکے اپنے جذبات کی تسکین کرلی، اور اس کے بعد وہاں سے اُٹھ کر سیدھے سڑک کے اس پار داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضری کے لئے جمع ہوگئے جہاں ان کے عرس کی تقریب منعقد ہورہی تھی۔ اس تقریب میں مزار پر فاتحہ ہی نہیں پڑھی جاتی، اسے گلاب اور کیوڑے سے غسل دیا جاتا ہے۔ اس پر چادریں چڑھائی جاتی ہیں، منّتیں مانی جاتی ہیں، سجدے کئے جاتے ہیں۔ پھر قوالیاں بھی ہوتی ہیں۔ انہی مسلمانوں نے، جنہوں نے اس امام کے پیچھے جو ان تمام بدعات کو کفر اور شرک سمجھتا تھا، نماز ادا کرکے اپنے جذبات کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا تھا، (یعنی ثواب حاصل کیا تھا) داتا صاحب کے عرس کی ان رسومات میں شریک ہوکر بھی اپنے جذبات کی تسکین کا سامان فراہم کرلیا۔ مذہب میں یہی کچھ ہوتا ہے اور طرفہ تماشہ یہ کہ جس حکومت کے زیر اہتمام بادشاہی مسجد کا اجتماع منعقد ہوا تھا اسی کے زیرِ انتظام عرس کی یہ تقریبات بھی سرانجام پا رہی تھیں۔ کیونکہ امورِ مذہبی اور اوقاف دونوں حکومتِ پاکستان کے زیر تحویل ہیں۔ ان دونوں سے آگے بڑھ کر مجھے اس اضافہ کی اجازت بھی دیجئے کہ اسی شام جناح باغ کے اوپن ائیر تھیٹر میں روسی طائفہ کے ناچ گانے کا تماشہ بھی ہوا اور عجب نہیں کہ مملکت کے کسی وزیر نے اس کا بھی افتتاح کیا ہو۔ یہ سب کچھ اس مملکت میں ہوا اور ہو رہا ہے، جس کے آئین میں اسلام کو مملکت کا مذہب قرار دیا گیا ہے۔ اگر مملکت کا ''مذہب'' نہیں۔۔۔ ''دین'' اسلام ہوتا تو اس میں اس قسم کی بوالعجبیوں کی گنجائش کیسے ہوسکتی تھی؟

اسلام وعظ بن گیا:

میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ مذہب میں دین، وعظ بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کی مثالوں کی بھی کچھ کمی نہیں۔ آپ حضرات میں (نوجوانوں کو چھوڑیے) جو ذرا عمر رسیدہ ہیں وہ اگر اپنے حافظہ پر زور دیں گے تو انہیں یاد آجائے گا کہ وہ بچپن سے سنتے چلے آرہے ہیں کہ اگر مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہوجائے تو ان پر دنیا کی کوئی قوم غالب نہ آسکے۔ یہ وعظ مسجدوں اور اسٹیجوں سے بڑھتے بڑھتے عالمگیر اجتماعات تک آپہنچے۔ دوسال قبل اسی لاہور میں مسلم ممالک کے سربراہوں کی ایک مہتم بالشان

کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں ہر مملکت کے نمائندہ نے مسلمانوں کے اتحاد اور اُمّت کی وحدت پر خطبات دیے، قرارداد یں پاس ہوئیں اور اس کے بعد یہ تمام سربراہ اسی طرح متفرق اور منتشر ہو گئے جس طرح اس کانفرنس میں شرکت سے پہلے تھے۔ اب اسی شان وشوکت سے سیرت کانگریس منعقد ہو رہی ہے جس میں مسلمانوں کی مختلف مملکتوں کے قریب ایک سو ممتاز مندوب شرکت فرما رہے ہیں۔ اس میں بھی ہر ایک کے خطاب کا مقطع کا بند یہ سنائی دیتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے چودہ سو برس قبل عالمی انسانی برادری کا جو تصوّر دیا تھا اگر آج دنیا بھر کے مسلمان اس پر عمل کریں، تو مسلمان قوم پوری دنیا پر حاوی ہو سکتی ہے۔ بحوالہ (نوائے وقت، 6 مارچ 1976ء)، سیرت کانگریس کے اجتماعات میں حسبِ معمول نہ صرف غلبہ اسلام کے لئے دعائیں مانگی گئیں بلکہ مرکزی حکومت پاکستان کے مذہبی امور کے وزیر (مولانا) کوثر نیازی صاحب نے یہ اعلان بھی فرمادیا کہ:

> 1976ء کا سال پاکستان کے لئے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ بلکہ یہ سال غلبہ اسلام کا سال ہے اور اس سال عالم اسلام کو کامل اتحاد نصیب ہوگا۔ اس سال باطل کی تمام قوتیں انشاء اللہ شکست کھائیں گی۔
>
> (نوائے وقت، لاہور، 6 مارچ، 1976ء)

اس پر یقیناً نعرہ ہائے تکبیر بلند ہوئے ہوں گے اور جن کے گوش، نصیحت نیوش ہوں گے، انہوں نے، مسجد سے ملحق مزارِ اقبالؒ سے اٹھتی ہوئی یہ دردناک صدا بھی سن لی ہو گی کہ:

مست رکھو ذکر وفکرِ صبح گاہی میں اُنہیں   پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں انہیں

ٹوئن بی کا انتباہ:

ہم (معاف بفرمائید) مذہب کے برگِ حشیش کے رسیا، اس قسم کے سنہرے خوابوں میں مدہوش رہنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ لیکن وہ دانشور، جن کی نگاہیں حقائق پر ہیں، دیکھئے کہ وہ ہمارے متعلق کیا کہتے ہیں۔ پروفیسر آرنلڈ ٹوئن بی عصرِ حاضر کا سب سے بڑا نامور مؤرخ ہے۔ وہ نیشنلزم پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> مغرب میں بعض دوسرے تصوّرات بھی ہیں جن کا باعثِ فوز وفلاح ہونا بے حد مشکوک ہے۔ ان میں سے ایک ہماری نیشنلزم ہے۔ تُرک اور بعض دیگر اسلامی ممالک بھی نیشنلزم کے تصوّر سے اسی طرح متاثر ہوتے جارہے ہیں جس طرح اور مغربی تصوّرات سے۔ ہمیں اپنے آپ سے پوچھنا چاہئے کہ جن مسلمانوں کا مذہبی عقیدہ یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان، بلالحاظ اختلافِ نسل، رنگ، زبان، عادات وغیرہ محض مسلمان ہونے کی حیثیت سے بھائی بھائی ہیں، ان میں بھی اگر نیشنلزم کا ایسا تنگ نظر عقیدہ رائج ہو گیا تو دنیا کا حشر کیا ہوگا؟ آج جبکہ مغربی صنعت کاری کی وجہ سے دنیا میں فاصلہ کا تصوّر آہستہ آہستہ مٹتا جارہا ہے۔۔۔ مسلمانوں کا اخوتِ باہمی کا عقیدہ، یقیناً مغرب کی تنگ نظر قومیت پرستی کے عقیدہ سے کہیں بہتر ہے اور یہی عقیدہ موجودہ زمانہ کے تقاضوں کو پورا کرسکتا ہے۔ برعکس مغربی عقیدہ کے جس نے یورپ میں، محض قومیت

کے معیار پر، درجنوں آزاد مملکتوں کو پیدا کر رکھا ہے، جن میں سے ہر ایک دوسری سے الگ ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد یورپ کی جو حالت ہو چکی ہے، اس میں یورپ کے اندر کم وبیش چالیس آزاد مملکتوں کا وجود ایک ایسا بڑا خطرہ ہے جس کا کوئی علاج ہی نہیں ہو سکتا۔ (خود یورپ کی تباہی کا تو یہ عالم ہے لیکن) یورپ کی تہذیب نے لوگوں کی آنکھوں کو ایسا چندھیا دیا ہے اس کے تصوّراتِ حیات کو آنکھیں بند کر کے اپنائے چلے جا رہے ہیں۔ ہمیں کم از کم مسلمانوں سے تو یہ توقع رکھنی چاہیئے کہ وہ اپنے عالمگیر مؤدت واخوت کے تصوّر کو چھوڑ کر یورپ کا ایسا تنگ نظری کا تصوّر اپنے ہاں رائج نہیں کریں گے۔ ایک عالمگیر برادری کا تصوّر، ویسے تو فلاحِ انسانی کے لئے ہمیشہ ضروری رہا ہے، لیکن اس ایٹم کے دور میں اس کی اہمیت اور ضرورت اور بھی شدید ہو گئی ہے۔(The World and the West)

دانشورانِ مغرب تو ہم سے یہ توقعات وابستہ کرتے ہیں اور ہماری یہ حالت ہے کہ کوئی مسلم مملکت اپنی جداگانہ قومیت کو چھوڑ کر، وحدتِ اُمّت کی طرف ایک قدم اٹھانے کے لئے تیار نہیں۔ ایسے، وعظ ان سے جتنے جی چاہے کرا لو۔

ایک سوال:

میرے ہاں عزیزانِ من! مغرب کے اکثر مفکرین ومصنفین آتے رہتے ہیں۔ میں ان کے سامنے اسلامی نظام کے اساسی عناصرِ ترکیبی پیش کرتا ہوں تو وہ کہا کرتے ہیں کہ ہمیں ان نظریات کے قابل قبول ہونے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن ہمارے اس سوال کا آپ کے پاس کیا جواب ہے کہ مسلمان ان نظریات کو اپنے ایمان کی بنیاد قرار دیتے ہیں، لیکن کیا آپ بتائیں گے کہ سارے عالمِ اسلام میں کسی ایک مسلم ملک میں بھی یہ نظام عملاً قائم ہے؟ اس کا جواب نفی میں ہے تو فرمائیے کہ جب آپ اس نظام کو خود اپنے ہاں قائم نہیں کرتے یا قائم نہیں کر سکتے تو دنیا کو اس کی دعوت کس منہ سے دے سکتے ہیں؟ میں تو ایک طرف، ان کے اس سوال کا جواب نہ ہماری سربراہی کانفرنس دے سکتی تھی نہ سیرت کانگریس، نہ ہی وہ حکومت جس کے زیرِ اہتمام اس قسم کی تقاریب منعقد ہوتی ہیں۔ ہم اس سوال کا جواب کیا دے سکیں گے، جو خود اپنی مملکت میں بھی ایمان کے اشتراک کی بنیاد پر ایک قوم نہیں بن سکے! عزیزانِ گرامی قدر! یاد رکھئے کسی نظریہ کو محض وعظ ونصیحت کے ذریعے نہیں پھیلایا جا سکتا۔ اسے اگر عملی نظام کی شکل میں قائم کر دیا جائے تو اس کے خوشگوار نتائج دنیا کے لئے وجہ کشش بن جاتے ہیں۔ خود حضور نبی اکرم ﷺ نے مکّہ میں تیرہ برس تک قرآنی نظریات کی تبلیغ فرمائی اور اس کی بڑی ضرورت تھی کیونکہ آپ ﷺ کے مخاطبین میں سے کوئی بھی ان نظریات کو ماننا تو ایک طرف، پہچانتا تک نہیں تھا۔ لیکن اس طریق سے تیرہ برس کے عرصہ میں ایک قلیل سی تعداد اسلام کی طرف آ سکی۔ مگر جب اس کے بعد حضور ﷺ نے اپنے مخلص اور صادق متبعین کی رفاقت سے اسلام کو بہ حیثیت ایک دین کے قائم کر دیا تو چند سال کے عرصہ میں يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا کی عملی تصویر دنیا کے سامنے آ گئی اور پھر جب یہ نظام ذرا آگے بڑھا تو عہد فاروقی رضی اللہ عنہ میں وہ ایران سے مصر تک ایک بحرِ موّاج بن گیا۔ یوں دنیا فوج در فوج، دین کے حصار

میں داخل ہوئی۔ اب بھی اگر کسی ایک خطۂ زمین میں یہ نظام عملاً قائم ہوجائے تو آپ دیکھیئے گا کہ اقوامِ عالم جو اپنے بنائے ہوئے نظاموں سے اس درجہ تنگ آ چکی ہیں، کس طرح لپک کر اس کی طرف بڑھتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو پھر عقل کے تجرباتی طریق کی سست رفتاری سے ایسا ہوگا اور نہ معلوم اس میں زمانہ کو اور کتنی کروٹیں بدلنا اور نوعِ انسان کو کس قدر ہولناک تباہیوں میں سے گزرنا پڑے گا کہ اس کے سوا اس کی فلاح ونجات کی کوئی شکل نہیں ہوگی۔ گوئٹےؔ نے اپنے دوست (Eckermann) کے نام اپنے خط میں کس قدر صحیح لکھا تھا کہ:

اسلام کی تعلیم کبھی ناکام ثابت نہیں ہوسکتی۔ ہم اپنے تمام نظام ہائے حیات کے باوجود اس سے آگے جا ہی نہیں سکے اور حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی انسان بھی اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ (بحوالہ خطباتِ اقبالؒ)

اور یہی ہے حضور ﷺ کے نبیٔ آخرالزمان ہونے کا مطلب اور ختمِ نبوّت کا مفہوم۔ حضور ﷺ کی رسالت زمان ومکان کی حدود سے ماورا ہے۔ دنیا کے آخری انسان کے لئے بھی حضور ﷺ ہی رسول ہیں۔ جو اس حقیقت پر یقین نہیں رکھتا اور کسی دوسرے ظہور یا اس کے امکان کو تسلیم کرتا ہے، رسالتِ محمدیہ ﷺ پر اس کے ایمان کا دعویٰ باطل ہے۔ اس کا شمار اُمّتِ محمدیہ ﷺ میں نہیں ہوسکتا۔ یہ میرا ایمان ہے عزیزانِ گرامی قدر! اور اسی ایمان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہونے کی میری آرزو ہے۔

یا رب ایں آرزوئے من چہ خوش است!

میں نے اسی قسم کے ایک اجتماع میں اپنے ایک خطاب میں کہا تھا کہ عصرِ حاضر کی بے پناہ تاریکیوں میں نظامِ محمدی ﷺ ہی وہ روشنی کا مینار ہے جو کشتی انسانیت کو ساحلِ مراد کی نشاندہی کرسکتا ہے۔ انسان کا موجودہ عالمگیر اضطراب، مایوسیوں کا مقامِ مرگ نہیں، اُمیدوں کی نشیدِ حیات ہے۔ یہ وہ خزاں ہے جو آنے والی بہار کے لئے طائرِ پیش رس ہوتی ہے۔ وہ آخرِ شب کی تاریکی ہے جس کے متعلق غالب نے کہا تھا کہ:

مژدہ صبح در این تیرہ شبانم دادند شمع کشتند و زخورشید نشانم دادند

مفہوم: مجھے اس تاریک رات میں صُبح کی خوشخبری سُناتے ہیں۔ (گویا رات بھر جلنے والے) چراغ کو بجھاتے ہیں اور آفتابِ عالم تاب کے اُبھرنے کے آثار دکھاتے ہیں۔ (م۔س۔ا)

دیکھنا یہ ہے کہ اس خورشید جہاںتاب کی پہلی کرنوں کی جبیں بوسی کی سعادت کس خطۂ زمین کے حصّے میں آتی ہے۔ جس کے نصیب میں یہ سعادت ہوگئی، اسی کی قسمت میں نوعِ انسان کی امامت (Leadership) ہوگی۔

اور یہی ہے طلوعِ سحر کی وہ یقین آفریں اُمید جس کی وجہ سے، میں بھی یہ کہتے ہوئے اس پیکرِ محبوبیت کا دامن تھامے بیٹھا ہوں کہ:

ترے سوا کوئی شائستۂ وفا بھی تو ہو میں ترے در سے جو اُٹھوں تو کس کے در جاؤں؟

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (33:56)

ماہنامہ طلوعِ اسلام اپریل 1976ء سے ماخوذ

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسلمانوں کے زوال میں پرستش کا کردار

قرآنِ کریم مسلمانوں کی زندگی کا محور و مرکز ہے۔ مسلمانوں کی زندگی کا مقصد ساری انسانیت کی نگرانی کرنا (2:143) اور ان کی خدمت کرنا ہے (3:118)، قرآنِ کریم وہ ضابطۂ حیات عطا کرتا ہے جس میں انسانیت کے مسائل اس طرح حل ہو جاتے ہیں کہ ہر شخص کو اس کا Due مل جاتا ہے۔ یہ نظام ایسا معاشرہ تشکیل دیتا ہے جس میں خوف و حزن نام کی کوئی چیز نہیں رہتی (2:277)، (2:38)، اس میں مکمل امن و سلامتی ہوتی ہے (3:97) قرآنی نظام میں ہر شخص کی خوابیدہ صلاحیتیں پوری پوری طور پر بیدار ہو جاتی ہیں (3:164)، (62:2)، اس میں رزق کی فراوانی ہوتی ہے (11:6)، (6:151) قرآنِ کریم کا یہ وعدہ ہے کہ قرآن کا یہ نظام غالب آ کر رہے گا (9:33، 48:28، 61:9) یہ نظام ایمان و اعمال صالحہ کے نتیجے میں قائم ہوتا ہے (24:55، 35:10) اس میں تشدد کا زبردستی کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

قرآنِ کریم کے ان تمام وعدوں کے برخلاف آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہم مسلمانوں کی حالت نہایت افسوسناک حد تک تباہی و بربادی سے دوچار ہے۔ یہ حالت مسلمانوں کے ایک یا دو ملکوں کی نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے جتنے بھی ممالک ہیں وہ سب اسی زوال اور کسمپرسی کا شکار ہیں اور اس کا سبب اور قدرِ مشترک ہمارے وہ عقائد ہیں جو ہمیں زوال کی طرف لے جا رہے ہیں۔ ہمارے اس زوال کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو بالکل ترک کر دیا ہے اور پرستش اور پوجا پاٹ کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دے دیا ہے ہمارے ہاں رات دن ہر شخص پرستش میں مصروف ہے اور دوسروں کو بھی پرستش کی ترغیب و تلقین کرتا ہے۔ مسلمانوں کے زوال کا سبب چونکہ پرستش ہے اس لیے ہمارے لیے نہایت ضروری ہے کہ ہم پہلے اطاعتِ خداوندی اور پرستش کے فرق کو واضح کریں۔

پرستش مذہب میں ہوتی ہے اور اطاعتِ خداوندی صرف اور صرف دین (اسلامی نظام) کی معرفت ہو سکتی ہے۔ اطاعت کے لیے اسلامی نظام، یعنی دین کا قیام لازمی چیز ہے۔ اگر دین یعنی اسلامی نظام قائم نہیں ہے تو اطاعتِ خداوندی نہیں ہو سکتی، پرستش میں خدا اور انسان کا براہ راست تعلق ہوتا ہے۔ یہ تعلق فردِ متعلقہ کے ذہن سے باہر نہیں ہوتا اور یہ سمجھ کر اپنے دل کو مطمئن کر لیا جاتا ہے کہ ہمارا تعلق اللہ سے قائم ہو گیا ہے۔ یہ تعلق خالصتاً انفرادی، داخلی Subjective ہوتا ہے۔ پرستش کرنے میں کسی نظام کی ضرورت نہیں ہوتی، آپ ہر جگہ، کونے کھدرے، جنگل صحرا، کسی جگہ بھی پرستش کر سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف اطاعت ہوتی ہے اطاعت کے مفہوم کو صحیح طور پر اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ نے دین قائم

فرمایا تھا اور اس نظام کے مقامی حکام، اولوالامر کی اطاعت کو بھی فرض قرار دیا گیا تھا۔ اللہ کی اطاعت صرف رسول کے ذریعے ہوسکتی ہے (4:80، 4:64) آپ رسول کو بیچ میں سے نکال دیں تو اللہ کی اطاعت نہیں کر سکتے۔ اسی طرح رسول کی اطاعت اولوالامر کے ذریعے ہوتی ہے۔ حضور ﷺ کی قائم کردہ ریاست دس لاکھ مربع میل پر وسیع تھی۔ حضور ﷺ کے اپنے دورِ مبارک میں بھی جو لوگ مدینے سے دور رہتے تھے وہ اپنے مقدمات مدینہ آ کر طے نہیں کراتے تھے بلکہ وہ اپنے مقامی حاکم سے اپنے مقدمات کے فیصلے کرا کے، ان کی اطاعت کرتے تھے۔ مقامی حاکم کی اطاعت ہی رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ہوتی تھی۔ مقامی حکام کی اطاعت کو فرض قرار دینے کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ رسول اللہ کی ذاتی اطاعت مقصود نہیں تھی بلکہ اس نظام کی اطاعت واجب و مقصود تھی جو حضور ﷺ نے قائم فرمایا تھا۔ اس نظام کی اطاعت ہی اللہ و رسول کی اطاعت تھی اگر وہ نظام قائم نہ ہو، جیسا کہ اس دور میں قائم نہیں ہے، تو اللہ و رسول کی اطاعت نہیں ہوسکتی۔ پرستش کے لیے کسی حکم دینے والے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لوگ پرستش کی رسوم از خود سرانجام دیتے چلے آرہے ہیں۔ لیکن اطاعت خداوندی کے لئے ایک محسوس، جیتی جاگتی اتھارٹی کی ضرورت ہوتی ہے جو اسلامی نظام کے ذریعے، اللہ و رسول کی اطاعت کراتی ہے۔ اسی لیے اطاعت کے لیے سماعت شرط ہوتی ہے ارشادِ عالی ہے۔

(1) وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۖ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ (2:285) ترجمہ: اور کہہ اُٹھے کہ ہم نے سُنا اور ہم نے قبول کیا، تیری بخشش چاہئے۔ اے ہمارے رب اور تیری طرف لوٹ کے جانا ہے۔

(2) ارشاد ہوا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ (8:20) اے ایمان والو، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم مانو، اور اس سے مت پھیرو درآں حالیکہ تم اس کے احکام سن رہے ہو۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ احکام کسی زندہ اتھارٹی سے ہی لیے جاسکتے ہیں اس سماعت کے مفہوم کو اگلی آیت نے اور بھی واضح کر دیا وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ (8:21) اور اس طرح نہ ہو جانا جو کہتے تو یہ ہیں کہ ہم نے احکامات کو سن لیا، لیکن درحقیقت وہ اس قدر توجہ سے نہیں سنتے کہ ان پر عمل پیرا ہوں۔

(3) فرمایا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ (8:24)، اے ایمان والو، اللہ اور رسول کی آواز پر لبیک کہو، کیونکہ وہ تمہیں اس کی دعوت دیتا ہے کہ جو تمہیں زندگی عطا کرنے والا ہے۔

(4) ارشاد فرمایا: اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (24:51) قرآنِ کریم کے احکامات پر عمل کرنا مومن ہونے کا ثبوت ہے اور اس کا عملی Test یہ ہے کہ تمہارے جتنے بھی متنازعہ فیہ امور ہوں تو تم رسول اللہ سے اس کا فیصلہ قرآن کے مطابق کرتے۔ لِيَحْكُمَ کا لفظ صرف پڑھنے کے لیے نہیں دیا گیا بلکہ یہ کفر اور ایمان کے درمیان واضح امتیاز ہے (5:44)، مومن کو اطاعتِ خداوندی کے لیے بلایا جاتا ہے کہ آؤ اللہ کی اطاعت کرو تو اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ؕ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور ہم نے اس کی اطاعت کی۔ دین

میں اطاعت کے لیے زندہ اتھارٹی کا ہونا ضروری ہے اس کے بغیر اطاعت ہو ہی نہیں سکتی، صرف پرستش ہو سکتی ہے۔

(5) ارشادِ عالی ہے۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ (64:16)

ترجمہ: تو جہاں تک ہو سکے اللہ سے ڈرو اور سنو اور مانو، اور اپنے بھلے کے لیے خرچ کرو۔ یہاں بھی سماعت، اطاعت کے لیے شرط قرار دی گئی ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی واضح رہے کہ پرستش کے نتائج اس دنیا میں سامنے نہیں آتے۔ جبکہ اطاعت کے نتائج اس دنیا میں سامنے آجاتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ (11:93) اے میری قوم تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتے جاؤ، اور میں اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتا ہوں نتائج بہت جلد اسی دنیا میں نمودار ہو جائیں گے اور بتا دیں گے کہ کس پر رسوا کُن عذاب آتا ہے اور کون سچا اور کون جھوٹا ہے۔ چند ہی آیات کے بعد پھر ارشادِ عالی ہوتا ہے وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ وَانْتَظِرُوْا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ (11:121-122) اے رسول (ﷺ) کہہ دیجئے ان لوگوں سے جو ایمان نہیں لائے کہ تم اپنے پروگرام پر عمل کرتے رہو، ہم اپنے پروگرام کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ اس کے بعد تم بھی نتائج کا انتظار کرو اور ہم بھی انتظار کرتے ہیں، سورہ زمر میں ارشاد ہوتا ہے قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ (39:39-40) تو کہہ دو اے قوم تم اپنی جگہ کام کئے جاؤ۔ میں اپنی جگہ کام کئے جاتا ہوں۔ اب تم جلد جان لو گے کہ کس پر آفت آتی ہے کہ اس کو رسوا کر دے اور اس پر ہمیشہ رہنے والا عذاب اترتا ہے۔

اطاعت خداوندی میں پرستش کا کسی جگہ کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس نکتہ کو ہم اس طرح واضح کرتے ہیں کہ جس میں اطاعت کے لیے کڑی سے کڑی مل جاتی ہے۔ آپ اس کو صرف توجہ سے ملاحظہ فرمالیں۔

اصل اطاعت اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ہے اللہ تعالیٰ چونکہ ہمارے حیطۂ ادراک سے باہر ہے اس لیے اس کی اطاعت کا واحد ذریعہ اس کا رسول ہے (4:64،4:80) اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا واحد ذریعہ اولوالامر (مقامی حکام) ہیں۔ 4:59 قرآن کریم میں یہ بھی ارشاد عالی ہے فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (4:65) ترجمہ: تیرے پروردگار کی قسم وہ مومن نہیں ہو سکتے مگر یہ کہ وہ اپنے اختلافات میں آپ کو حکم اور فیصلہ کرنے والا مانیں اور پھر آپؐ کے فیصلہ پر اپنے دل میں کوئی ناراضی محسوس نہ کریں بلکہ اس کو مکمل طور پر تسلیم کر لیں۔ رسول اللہؐ کے فیصلوں کو تسلیم کرنا رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ہے۔ چونکہ حضور ﷺ کے اُن فیصلوں کو عملی طور پر اولوالامر نافذ کرتے تھے، اس لئے ان کی اطاعت فرض تھی اور ان کی اطاعت رسولؐ کی اطاعت تھی۔ اور اسی وجہ سے حضور نے فرمایا تھا کہ اسلامی مملکت کے حاکموں کی اطاعت میری اطاعت ہے۔

(1) من أطاع محمدًا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقد أطاع اللہ ومن عصی محمدًا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقد عصی اللہ و محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرّق بین الناس۔ (ترجمہ) جس نے محمدؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے محمدؐ کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اللہ کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے درمیان محمدؐ نشان امتیاز ہیں۔ اس اطاعت کی عملی صورت خود حضور نے بیان فرمائی اور خود اطاعت کرنے کی کڑی سے کڑی ملا دی۔

(2) (ترجمہ) سنن ابن ماجہ، کتاب الجہاد، باب طاعۃ الامام،) رسول اللہ نے فرمایا کہ جس نے میری اطاعت کی تو اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے امام کی اطاعت کی تو اس نے میری اطاعت کی اور جس نے امام کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

(3) مسلمان کو لازم ہے کہ وہ اپنے اولوالامر کی بات سنے اور مانے، خواہ اس کو پسند ہو یا ناپسند ہو تا وقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے اور جب اُسے معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر اُسے نہ کچھ سننا چاہئے اور نہ ماننا چاہئے۔

(4) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ جو حاکم کی اطاعت کرتا ہے وہ میری اطاعت کرتا ہے جو حاکم کی نافرمانی کرتا ہے وہ میری نافرمانی کرتا ہے (بخاری و مسلم)

(5) حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ حاکم کا حکم ماننا اور سننا خواہ کسی ایسے حبشی غلام کا حکم ہو جس کا سر کشمش کی طرح ہو۔ (بخاری و مسلم)

آپ غور فرما رہے ہیں کہ اطاعت کرنے کی کڑیاں کس طرح مل رہی ہیں اور اس میں اللہ کی اطاعت رسول کے ذریعے اور رسول کی اطاعت حاکم کے ذریعے ہو رہی ہے۔ لیکن اگر کسی جگہ اسلامی نظام کا حاکم نہ ہو تو نہ اللہ کی اطاعت ہو سکتی ہے اور نہ رسول کی۔ اور پرستش اطاعت کا متبادل نہیں ہو سکتی، لیکن ہم اسی دھوکہ میں رہتے ہیں کہ ہم پرستش کے ذریعے اللہ ورسول کی اطاعت کر رہے ہیں۔

قرآنِ کریم نے اطاعت کے لفظ کے علاوہ عبادت کا لفظ بھی استعمال کیا ہے اور اسی دوازہ سے ہمارے ہاں پرستش داخل کی گئی ہے۔ ہمارے ہاں عبادت کا ترجمہ پرستش کیا گیا ہے۔ حضرت شیخ الہند نے اپنے مشہور اور مستند ترجمہ میں عبادت کا ترجمہ پوجنا کیا ہے ملاحظہ ہو (39:66، 39:14، 39:17، 43:45، 43:8) اور بکثرت دیگر مقامات ہمارے مترجمین عموماً عبادت کا ترجمہ ''بندگی کیا کرتے ہیں۔ لیکن یہ لفظ بھی Mislead کرتا ہے کیونکہ فارسی زبان میں بندگی کے معنی تابعداری اور غلامی کے ہیں (لغات کشوری) لیکن ہندی میں اس کے معنی پرستش کرنا ہے۔ اس لئے اردو میں یہ لفظ دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن قرآنِ کریم نے اس کو صرف اور صرف محکومیت کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

(1) سورہ بقرہ میں، قصاص کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا کہ اَلْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی ط اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ

(2:178) یعنی قصاص میں چھوٹے بڑے، آزاد اور غلام کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ آزاد کے بدلے میں آزاد کو ہی قتل کیا جائے گا اور غلام کے بدلے غلام کو۔ اسی آیۂ کریمہ میں قرآنِ کریم العبد کو الحر کے مقابلے میں لایا ہے حُر آزاد ہوتا ہے اور العبد اس کا غلام ہوتا ہے، وہ اس کی پرستش نہیں کرتا۔ صرف اطاعت کرتا ہے۔

(2) سورہ النحل میں العبد کی Definition، اس سے بھی زیادہ واضح کر دی گئی ہے جبکہ ارشاد ہوتا ہے عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ (16:75)، ترجمہ: بندہ، پرایا مال، نہیں قدرت رکھتا کسی چیز پر (شیخ الہند)۔ اس آیت میں قرآن نے عبد کی یہ تعریف کی ہے کہ عبد وہ ہوتا ہے جو دوسرے کا مال ہوتا ہے۔ اپنے پر بھی کسی طرح کی قدرت نہیں رکھتا ہر ایک تصرف میں مالک کی اجازت کا محتاج ہوتا ہے۔ مالک کی اجازت کے بغیر سب تصرفات غیر معتبر ہوتے ہیں۔ اس کو تو اپنی جان تک پر تصرف واختیار نہیں ہوتا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود کوئی غلام اپنے آقا کی پرستش نہیں کرتا اس لئے عبادت کے بنیادی معنی میں پرستش کا کوئی تصور دور دور تک نہیں ہے۔

(3) حضرت موسیٰ نے فرعون کو ایمان لانے کی دعوت دی تو اس نے اس دعوت کو مسترد کر دیا اور اس دعوت کا مذاق اڑایا اور کہا کہ ہم اس قوم کے نمائندوں کی دعوت تسلیم کر لیں جو خود ہمارے محکوم ہیں۔ چنانچہ اس جگہ قرآنِ کریم نے محکوم کے لئے عابد کا لفظ استعمال کیا ہے۔ فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ (23:47) ترجمہ: انہوں نے کہا ہم ان دو اپنے جیسے آدمیوں پر ایمان لے آئیں حالانکہ اُن کی قوم ہماری محکوم ہے۔ اس آیت نے عابد کے معنی واضح کر دیئے۔

(4) حضرت موسیٰؑ کے حوالہ سے ہی ایک دوسری آیت ہے کہ فرعون نے حضرت موسیٰؑ پر اپنے احسانات یاد دلائے تو حضرت موسیٰؑ نے جواب میں فرمایا تھا۔ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (26:22) ترجمہ: کیا یہی وہ نعمتیں ہیں جن کا تم مجھ پر احسان رکھ رہے ہو کہ تم نے بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا رکھا ہے غور فرمائیں یہاں عبدت کس طرح محکومیت کے مفہوم کو واضح کر رہا ہے اور پرستش کی تردید کر رہا ہے۔

(5) سورہ یوسف میں ارشاد ہوتا ہے اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (12:40) ترجمہ: حکومت اللہ کے علاوہ اور کسی کی نہیں ہوسکتی، اس کے بعد اسی آیت کے دوسرے حصہ میں فرمایا اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ (12:40) ترجمہ: اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی عبودیت (محکومیت) اختیار نہ کرو۔ اس ایک ہی آیت میں قرآن نے حکومت اور عبادت کے الفاظ کو ایک ہی معنی میں استعمال کر دیا کہ عبادت کے معنی پرستش کے نہیں بلکہ محکومیت کے ہیں۔

پرستش کے موضوع پر غور کرنے، اور اس کی تردید کرنے کے ذیل میں صلوٰۃ کا موضوع بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اقامت صلوٰۃ کا ترجمہ "نماز پڑھنا" کر کے، اس کو پرستش کے زمرہ میں شامل کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اقامۃ کے لفظ خود پکار پکار کر اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے صلوٰۃ کا پرستش سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہمارے ہاں صلوٰۃ کا ترجمہ نماز کیا جاتا ہے۔ بنو عباس کے دور میں جب ہمارا لٹریچر تحریر کیا گیا تھا، تو ایرانیوں کے زیر اثر قرآنِ کریم کی اصطلاحات کے قرآنی مفہوم ترک کر کے غیر

قرآنی مفاہیم اختیار کئے گئے تھے۔ ان اصطلاحات میں صلوٰۃ کا لفظ بھی شامل ہے اور اقامت صلوٰۃ کا ترجمہ ''نماز پڑھنا'' کر دیا گیا۔

سورہ حج میں ارشاد عالی ہوتا ہے اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (22:41) یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم اُنہیں زمین پر حکومت دیں تو یہ صلوٰۃ قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں، نیکیوں کا حکم کریں اور برائیوں سے منع کریں۔ اس آیۂ کریمہ میں اقامتِ صلوٰۃ کے لیے اقتدار شرط قرار دیا گیا ہے۔ اگر کسی قوم کو اقتدار حاصل نہیں ہے تو وہ قوم اقامتِ صلوٰۃ نہیں کر سکتی۔ مشہور درسی متداول تفسیر جلالین نے اس آیت کے مفہوم کو خوب واضح کیا ہے جو مفہوم ہماری صد فی صد تائید کر رہا ہے۔ اس تفسیر میں تحریر ہے ''یہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر ہم اُنہیں دنیا میں حکومت دے دیں تو یہ لوگ نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور دوسروں کو بھی نیک کام کا حکم کریں اور بُرے کام سے منع کریں۔ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ شرط تھا۔ اقامتِ اصلوٰۃ اور اس کے بعد کا جملہ اس شرط کا جواب ہے۔ نیز شرط اور جواب الشرط دونوں صلہ ہیں الذین موصول کے، اس سے قبل ایک مبتداء محذوف ہے ہم تفسیر نے جو عربی گرائمر تحریر کی ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ اقتدار شرط ہے اور اس اقتدار کا جواب الشرط، اقامتِ صلوٰۃ ہے۔ اگر شرط (اقتدار) پوری نہ ہو، تو جواب الشرط خود ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اگر شرط ختم ہو جائے، تو مشروط خود ختم ہو جاتا ہے۔ اس تفسیر کا اصرار یہ ہے کہ اقامتِ صلوٰہ کے لئے اقتدار ضروری ہے۔ اور Prerequisite قرآنِ کریم کی عائد کردہ اس شرط کے بعد اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم نماز پڑھنا کبھی نہیں ہو سکتا۔ اصل یہ ہے کہ اقامتِ دین اور اقامت صلوٰۃ دونوں ایک ہی چیز ہیں اور دونوں کے لیے اقتدار شرط ہے (22:41، 24:55) بغیر اقتدار کے نہ اقامت دین ممکن ہے اور نہ ہی اقامتِ صلوٰۃ ممکن ہے اور ہم مسلمانوں کے لیے دونوں کی اقامت فرض ہے۔ وہ معاشرہ جو قوانینِ خداوندی اور اس کی مستقل اقدار کے مطابق Establish ہوتا ہے، یہ عمل اقامتِ صلوٰۃ کہلاتا ہے۔

جہاں تک وقتی اجتماعات صلوٰۃ یعنی نماز پڑھنے کا تعلق ہے یہ اجتماعات صلوٰۃ اسی نظام کا ایک حصہ میں ارشادِ عالی ہے وَالَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۪ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَیْنَهُمْ ۪ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ (42:38) ترجمہ اور جنہوں نے اپنے رب کی پکار کا جواب دیا، اور نماز کو قائم کیا اور آپس کے مشورہ سے کام کیا اور ہمارا دیا ہوا کچھ خرچ کیا۔ اسلامی مملکت کو چلانے کے لئے، مقامی انتظامی یونٹ جب مشورہ کرتے ہیں تو اس سے پہلے یہ نماز ادا کرتے ہیں۔ مشورہ سے پیشتر اس نماز کا ادا کرنا اس بات کا اظہار کرنا ہے کہ ہم اس نظام کو دل کی گہرائیوں سے تسلیم کرتے ہیں اور اس کے لئے سجود و رکوع کے ذریعے اس کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ ان مقامی اداروں میں ادا کی جائے گی، جہاں اس نظام کو چلانے کے لیے مشورے کئے جاتے ہیں یہ نماز اس نظام کے تحت ادا ہوگی اور اس نظام کے کارکنان جن کو قرآنِ کریم نے حاملینِ عرش الٰہی کہا ہے، (39:75، 40:7) وہ ہی اس کو Lead کریں گے چونکہ یہ نماز اس نظام کا حصہ ہوگی، اس کے تحت ہوگی، اس پرستش

کے زمرہ میں نہیں آسکتیں، کیونکہ ان مشوروں میں نظام کی اطاعت کے طریقوں پر غور وفکر کیا جائے گا، اور ان مشوروں کے نتائج بھی اسی دنیا میں سامنے آجائیں گے۔

نماز میں قیام ورکوع وسجدہ وغیرہ کی جو عملی شکل ہمارے سامنے آتی ہے وہ اسی مقصد کے لیے ہے کہ جب ان جذبات کا اظہار اجتماعی شکل میں ہو تو اظہارِ جذبات کی محسوس حرکات میں ہم آہنگی ہو ورنہ اجتماع میں انتشار دکھائی دے گا۔ اطاعت وفرماں پذیری کے والہانہ جذبات کے اظہار میں نظم وضبط کا ملحوظ رکھنا بہت بڑی تربیتِ نفس ہے۔

اُمت کے مختلف فرقے جس طریقے سے نماز پڑھتے چلے آرہے ہیں۔ ان میں ردّ وبدل کا کسی کو اختیار نہیں ہے۔ اگر مسلمانوں میں پھر سے خلافت علیٰ منہاجِ نبوّت قائم ہوجائے اور وہ اجتماع صلوٰۃ کی ایک شکل تجویز کردے تو اُمت میں وحدت پیدا ہوجائے گی۔ ہم معاشرہ میں اصلاح یا قرآنی معاشرہ کے قیام کی جدوجہد اپنے گھر ہی سے کرسکتے ہیں لیکن اگر خود ہی نماز روزہ چھوڑ دیں گے تو اصلاح کس طرح ہوگی۔

طلوعِ اسلام میں اشتہارات کے نئے ریٹس

جنوری 2016ء سے طلوعِ اسلام میں چھپنے والے اشتہارات کے نئے ریٹ درجِ ذیل ہیں۔

ٹائٹل صفحات

	ماہانہ وار	سالانہ
بیک ٹائٹل بیرونی (چار رنگہ آرٹ پیپر)	-/6,000روپے	-/60,000روپے
اندرونی ٹائٹل (ایک رنگہ آرٹ پیپر)	-/4,000روپے	-/40,000روپے
اندرونی ٹائٹل (چار رنگہ آرٹ پیپر)	-/5,000روپے	-/50,000روپے

اندرونی صفحات

	ماہانہ وار	سالانہ
مکمل صفحہ (یک رنگہ)	-/3000روپے	-/30,000روپے
نصف صفحہ (یک رنگہ)	-/1500روپے	-/15,000روپے

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد
dr.inam57@gmail.com

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

قرآنی تعلیمات کے مطابق مرد عورت سے افضل اور نہ ہی عورت مرد سے کمتر ہے

میرا واضح موقف رہا ہے کہ نکاح کا معاہدہ کرتے وقت والدین کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ نکاح بطور معاہدہ کی کم از کم اہم تفصیلات اور اِس سے متعلقہ عورت کے مقام کی حقیقت کے قرآنی موقف کو بچوں/بچیوں کے نکاح یا اُس سے قبل موقعہ پر جاننا اُن کا بنیادی اور قانونی حق ہے۔ عورتوں کا مرد سے کمتر ہونے کا من گھڑت روایاتی اسلامی موقف قرآنی تعلیمات کے مُتضاد ہے۔ قرآن تو اِس ضِمن میں بلکہ آگے بڑھ کر یہ موقف پیش کرتا ہے کہ نہ صرف مرد وزن کے درمیان امتیاز بلکہ ذات پات، حسب ونسب اور رنگ ونسل کے سبھی امتیازات قرآن کے یکساں احترامِ انسانیت کے موقف کے منافی ہیں۔

مرد وزن دونوں کو یکساں مقام دینے میں قرآن کا موقف:

قرآن یہ واضح اور دوٹوک اعلان کرتا ہے کہ ہر انسان محض انسان ہونے کی حیثیت سے یکساں واجب الاحترام ہے۔

وَلَقَدۡ كَرَّمۡنَا بَنِيۡٓ اٰدَمَ (17:70)

''یہ حقیقت ہے کہ ہم نے تمام فرزندانِ آدم کو واجبُ التکریم بنایا ہے''۔

یہاں آدم کی اولاد کا ذکر کر کے خود بخود دونوں مرد وزن شامل ہوتے ہیں۔ اس آیت کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ معاشرہ میں پائے جانے والے ذات پات، حسب ونسب اور رنگ ونسل کے تمام امتیازات ختم ہو جاتے ہیں۔ قرآنِ کریم کی رو سے یکساں احترامِ آدمیت کے تحت جنسی تفریق بھی نہ وجہِ ذلت ہے نہ باعثِ امتیاز، یعنی نہ مرد، محض مرد ہونے کی حیثیت سے، عورتوں سے افضل ہے، اور نہ ہی عورتیں محض عورت ہونے کی بناء پر مردوں سے کمتر ہیں۔ مرد اور عورت کی ساخت میں فرق ہے، لیکن اس کا تعلق ان کے طبیعی وظائفِ حیات سے ہے۔ انسانیت کی سطح پر دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس میں عمل کا میدان دونوں کے لئے یکساں ہے اور عمل کے نتائج بھی یکساں۔

مرد وزن میں یکساں صِفات کے ودیعت کئے جانے کے موقف کی مکمل طور پر قرآن سے یوں بھی واضح تائید حاصل ہوتی ہے کہ:

اِنَّ الۡمُسۡلِمِيۡنَ وَالۡمُسۡلِمٰتِ وَالۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ وَالۡقٰنِتِيۡنَ وَالۡقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيۡنَ وَالصّٰدِقٰتِ

وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا(35:33)

قرآن کے معیار کی رو سے مرد وزن دونوں کی خصوصیات یہ ہونی چاہئیں۔

(1) قوانین خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے ہوئے ہوں؛ (اَلْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ)۔

(2) ان قوانین کی صداقت، اور ان کی نتیجہ خیزی پر دل کی گہرائیوں سے یقین رکھتے ہوں، اور ان پر عمل کر کے، ان کی نتیجہ خیزی کو دنیا کو دکھا دینے والے ہوں (وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ)۔

(3) اپنی صلاحیّتوں کی نشو ونما کر کے، اُنہیں محفوظ رکھتے ہوں، اور اُنہیں صرف وہاں صَرف کرتے ہوں، جہاں صَرف کرنے کا حکم قوانین خداوندی کی رو سے ملے (وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ)۔

(4) وہ عہد جو اُنہوں نے اپنے خدا سے باندھا ہے (9:111)، یا بندوں سے کیا ہے، اسے اپنے عمل سے سچ کر دکھائیں (وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ)۔

(5) مشکلات اور مصائب کے مقابلے میں، ثابت قدم، اور مستقل مزاج رہیں (وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ)۔

(6) انسانیّت کی خدمت کے لئے شاخِ ثمر دار کی طرح جھکے ہوئے ہوں (وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ)۔

(7) اپنی ہر متاع کو، نظام خداوندی پر نچھاور کر دینے کے لئے تیار ہوں (وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ)۔

(8) قوانین خداوندی نے جہاں جہاں سے رکنے کا حکم دیا ہے، وہاں سے رکیں اور ان پر جو پابندیاں عائد کی گئی ہیں، ان کا پورا پورا خیال رکھیں (وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ)۔

(9) اپنی عفت وعصمت کی پوری پوری حفاظت کریں (وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ)۔

(10) غرضیکہ، زندگی کے ہر قدم پر، قوانین خداوندی، کو اپنے سامنے رکھیں (وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ)۔

قرآن اِنہی صِفات کے حامِل دونوں مرد وزن کی شہادت دیتا ہے کہ

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا (4:124)

یہ ہیں وہ مومن مرد وزن جنہیں خدا کا قانون مکافات، زندگی کی ہر تباہی سے محفوظ رکھے گا، اور اِنہیں، اِن کی سعی وعمل کا اجر عظیم عطا کرے گا اور ذرہ برابر ظلم نہیں ہوگا۔

قرآن کی رو سے مردوں اور عورتوں کی حیثیت کے درمیان میں کوئی امتیاز روا رکھنا جائز نہیں۔

دنیا کی سبھی قانون کی کتابوں میں صیغے اور ضمیریں تمام مذکر استعمال ہوتے ہیں، لیکن ان میں عورتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ اِسی طرح قرآن میں بھی صیغہ اور ضمیریں مذکّر ہوتے ہیں، لیکن ان میں عورتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ مثلاً قرآن میں جہاں جہاں مومنین (مذکّر کے صیغے) کا ذکر آتا ہے، تو اس کے معنی مرد اور عورت دونوں ہوتے ہیں یعنی مرد اور عورت دونوں

مومن ہوتے ہیں۔

مندرجہ بالا آیت میں، مردوں اور عورتوں کا ذکر علیحدہ علیحدہ اور نکھار کر کیا گیا ہے۔ نمایاں طور پر بتانا یہ مقصود ہے کہ مرد اور عورت دونوں ہمدوش اور یکساں چلتے ہیں۔ اگر مذکر کا صیغہ استعمال ہوتا ہے تو مؤنث اس میں خود بخود شامل ہوتی ہے۔ علیحدہ علیحدہ ذکر کر کے بتایا یہ گیا ہے کہ عورتوں میں بھی وہی خصوصیّت پیدا ہو سکتی ہیں، جو مرد اپنے اندر پیدا کر سکتے ہیں۔ اِس بنا پر عورت کے درجہ کو مرد سے کمتر رکھنے کا موقف یکسر غیر قرآنی اور باطل اور غلط نگہی پر مبنی ہے۔

غور کرنے کے بعد یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مندرجہ بالا میں سبھی اہم خصوصیات کا ذکر شامل ہے جن کی موجودگی ضروری ہوتی ہے۔ آیت کے آخر میں مومن مرد اور عورت دونوں ہی کے لئے حفاظت اور اجر عظیم بتایا گیا ہے۔ عورت کا مردوں کے ہمدوش ذکر سے بتانا یہ مقصود ہے کہ عورت خود مقصود بالذّات ہے۔

اِس موقف کی قرآن کریم مزید وضاحت کرتے ہوئے ارشاد کرتا ہے کہ:

اَنِّیۡ لَاۤ اُضِیۡعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنۡکُمۡ مِّنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی ۚ بَعۡضُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ ۚ (3:195)

’’میں ضائع نہیں کرتا کسی محنت کرنے والے کی محنت، تم میں مرد ہو یا عورت۔ تم آپس میں ایک ہو‘‘۔

اگر کوئی چاہے مرد ہو یا عورت ایک دوسرے سے آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو اُس کا معیار واضح کرتے ہوئے بتایا کہ پیدائش کے اعتبار سے تمام انسان یکساں طور پر واجبُ الاحترام ہیں، لیکن اس کے آگے احترام کے مدارج کے اگر کوئی امتیاز روا رکھا گیا ہے تو وہ ان کے اعمال (کاموں) کے مطابق مرتب ہوں گے۔

وَ لِکُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوۡا ۚ (46:19)

’’ہر ایک کے مدارج ان کے اعمال (کاموں) کے مطابق مرتب ہوں گے۔‘‘

اعمال پر مبنی مدارج کے تعین میں پورے قرآن میں انسانیت کے لئے ایک ہی معیار بتایا گیا ہے اور وہ اَکۡرَمَکُمۡ میں پوشیدہ ہے اور اُس مقام کے حصول کا بھی سبھی مرد و زن کے لئے یکساں اور مساویانہ ایک ہی معیار مقرر کیا ہے کہ

اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ ؕ (49:13)

’’تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ واجبُ التکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ شعار (قوانین کی نگہداشت کرنے والا) ہے۔‘‘

اِس ایک معیار کا حصول دونوں مرد و زن کے لئے یکساں ہوتا ہے اور سبھی دوسرے طاقت، دولت اور جنسی تفریق کے معیار کے بل بوتے پر استوار کئے انسان کے بنائے ہوئے درجات کے معیارات کو جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دیا ہے۔

آگے بڑھنے کے واحد معیار ’’ اَکۡرَمَکُمۡ ‘‘، بمعنی کریم کے معنی ہیں اس طرح نفع پہنچانا کہ اس میں کسی طرح کی تذلیل وسُبکی محسوس نہ ہو۔ ساتھ ہی یہ کہ جو نفع پہنچایا جائے وہ بلند اور باشرف ہو۔ اس طرح عربوں میں الکریم تقویٰ کی ایک ایسی

جامع صفت ہے، جس میں ہر قسم کی بھلائیاں، فضیلتیں اور شرف شامل ہیں۔ چنانچہ یہ ایسے شخص کے لئے بولا جاتا ہے، جس میں کسی قسم کی مذموم صفت نہ پائی جائے۔ نیز آزاد اور شریف، نجیب، سخی، خوش نہاد۔ نرم خو، خلیق، وسیع الظرف، عمدہ حسب و نسب کی سبھی صفات اِس میں آجاتی ہیں۔

ہمیں یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ احترامِ آدمیت کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا غلام یا محکوم نہ ہو۔ ہر ایک کو یکساں طور پر آزادی حاصل ہو۔ انسان ایک غیر مرئی تصور ہے جس میں دونوں مرد و زن یکساں حیثیت سے شامل ہوتے ہیں۔ قرآن کا اس بات میں واضح فیصلہ ہے کہ:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
(3:79)

''کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا اسے کتاب و حکومت اور نبوت عطا کرے، اور وہ دوسرے لوگوں سے کہے کہ تم خدا سے ورے میرے غلام اور محکوم بن جاؤ۔''

قرآنی معاشرہ میں نہ کسی عدلیہ کو اس کا حق حاصل ہے، اور نہ ہی حکومت کو کہ کسی فرد یا معاشرہ کو اپنی مرضی کے تابع چلائے، اور نہ ہی مذہب کی دنیا میں۔ اور تو اور کسی نبی تک کو اس کا اختیار نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنائے۔

علامہ اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں اِسے یوں بیان کیا ہے کہ:

یہ ایک سجدہ جسے تُو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

ہمیں قرآن کی طرف سے یہی ہدایات دی گئی ہیں کہ اللہ کے حکم کے علاوہ/ مخالف کسی دوسرے کے حکم کے آگے سر جُھکانا اللہ کے نزدیک ناقابلِ معافی جرم شرک کے مترادف ہے۔

شِرک کے ضِمن میں اِس موقف کی وضاحت بھی ضروری ہو جاتی ہے جو مذہبی پیشوائیت کی طرف سے روایتی تفسیری اسلام سے منسوب سامنے لایا جاتا ہے کہ اولاد کو والدین اور بیوی کو شوہر کے ہر حُکم کی اطاعت کرنا فرض ہے۔ اِن کو والدین/ شوہر کے ہر حُکم کے آگے سر جُھکانے کی غیر مشروط تلقین کی جاتی ہے۔ قرآن اِس تلقین کو اپنی تعلیم کے منافی گردانتے ہوئے واضح ہدایت دیتا ہے کہ:

قرآن کی طرف سے واضح ہدایت ہے کہ:

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا (31:15)

اور اگر والدین تم پر زور دیں کہ تم شرک کے مرتکب ہو، جس کے متعلق تیرے پاس کوئی دلیل نہ ہو، تو تم ان کی بات نہ ماننا۔ البتہ دنیاوی معاملات میں، ان سے نیک برتاؤ کرتے رہو،

فیملی لائف میں یہ بھی یاد رکھنا چاہئیے کہ اگر والدین خدا کے ساتھ شرک کرنے کے لئے کہیں تو کہا فَلَا تُطِعۡهُمَا (31:15) ''شرک کرنے کو کہیں، تو ان کی اطاعت مت کرو۔'' والدین کا شکر گزار ہونا یہ ہے کہ عمر کے تقاضے کے سبب، جب ان میں کمی واقع ہو تو ان کمیوں کو اپنی بھرپور صلاحیتوں سے پورا کردو۔ والدین کے باب میں قرآن نے ہماری راہ نمائی کے لئے اسوہء ابراھیمی کو پیش کیا ہے۔ جس میں شرک کے خلاف اُنہوں نے اپنے باپ سے علیحدگی اختیار کرتے ہوئے اُن کے مقابل اعلانِ جنگ کردیا۔

دونوں مردوزن کو یکساں طور پر بتادیا گیا ہے کہ اطاعت صرف خدا کے قوانین کی ہوسکتی ہے اس لئے کہا فَلَا تُطِعۡهُمَا ''اطاعت کسی کی نہیں کرنا''۔ اطاعت کسی کا حکم ماننا ہوتا ہے، کسی کے قانون کے مطابق چلنا ہوتا ہے۔ اطاعت وہ ہے جو بغیر جبر کے، پوری رضامندی سے کی جائے۔ اگر جبر ہے یا رضامندی کے بغیر حکم مانا ہے، تو اس کے لیے اطاعت کا لفظ آتا ہی نہیں ہے۔ جو کھجور پک کر از خود گرے اسے اطاع النخل کہتے ہیں۔ اگر کھجوروں کو ڈنڈا مار کے گرایا جائے تو عرب اس کے لیے اطاع النخل کا لفظ استعمال نہیں کرتے۔ خدا کے لئے بھی اطاعت کا لفظ آتا ہے، لہٰذا خدا کی اطاعت بغیر جبر کے، پوری رضامندی سے، اپنے اختیار وارادے سے کی جائے گی۔

ظاہر ہے کہ ماں، باپ اور شوہر کی ایسی بِلا مشروط اطاعت کی تلقین، اللہ کے حُکم میں شراکت کی دعویدار ہے، لہٰذا نا قابلِ قبول ہے۔ قرآن کا موقف ہے کہ:

وَّلَا يُشۡرِكُ فِىۡ حُكۡمِهٖۤ اَحَدًا (18:26)

اللہ تعالیٰ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

قرآن کے اِس تمہیدی مُثبت بنیادی موقف کے بیان کے بعد اب یہاں ہم بات کا آغاز نکاح سے کرتے ہیں۔

نکاح کا مفہوم:

نکاح کے لغوی معانی ملانے اور جمع کرنے کے ہیں، لیکن اس طرح ملانا، جس طرح نیند آنکھوں میں گھل مل جاتی ہے، یا جس طرح بارش کے قطرے زمین کے اندر جذب ہو جاتے ہیں۔

اس سے مفہوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے جو میاں بیوی کا عائلی زندگی میں نقشہ پیش کیا ہے اس میں نکاح سے مراد میاں بیوی کا ایسا تعلق ہے، جیسا آنکھ اور نیند کا ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ میاں بیوی میں یہ تعلق اسی صورت قائم رہ سکتا ہے، جب دونوں میں فکر ونظر کی ہم آہنگی، ذوق ومزاج، خیالات وتصوررات اور نظریات ومعتقدات کی یک جہتی ہو۔

اِس کی وضاحت خود قرآن نے باہمی مُتضاد نظریہ حیات رکھنے کی وجہ سے مومن اور مُشرک کے درمیان نکاح کی ممانعت کہ یہ کہہ کر کی ہے کہ

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۭ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۭ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ۭ (2:221)

مشرکہ عورتوں سے، جب تک وہ ایمان نہ لائیں، ان کے ساتھ نکاح نہ کرو۔ ایک مومنہ لونڈی ایک (آزاد) مشرکہ سے بہتر ہے اگرچہ مشرکہ تمہیں کتنی ہی اچھی کیوں نہ لگے۔ اور مشرک جب تک ایمان نہ لائیں، اپنی عورتوں کو ان کے نکاح میں نہ دو۔ ایک مومن غلام ایک مشرک (آزاد) سے بہتر ہے، اگرچہ مشرک تمہیں کتنا ہی اچھا کیوں نہ لگے۔

کافر، مشرک اور مومن کی اصطلاحات کا مفہوم:

اِس آیت میں قرآن کی تین اصطلاحوں کا ذکر ہے، جس کا مُختصر تعارف بیان کیا جاتا ہے۔

یاد رہے کہ پیدائش کے لحاظ سے ہر بچہ مسلمان، کافر اور مُشرک پیدا نہیں ہوتا ہے۔ یہ تو انسان کے خیالات، نظریات، اعتقادات اور فکر ہوتی ہے، جسکی رو سے ایک انسان کافر، مشرک اور مومن بنتا ہے۔ اگر خیالات و نظریات قرآن کے خلاف ہیں، اور قوانین خداوندی کو کوئی تسلیم ہی نہیں کرتا، تو وہ کافر ہے۔

اگر کوئی قرآن کی تعلیم کو تسلیم کرتے ہوئے، عملاً اطاعت کے لیے غیر خداوندی قوانین کو بھی قوانین خداوندی کے ساتھ ملاتا ہے، تو وہ مشرک ہے۔

اور جو قوانین خداوندی کی صداقت کو تسلیم کر کے، ان کے مطابق اپنی زندگی بسر کرتا ہے، تو وہ مومن ہے۔

نظریات کے اِس یکسانیت کے تعلق کے لئے بلا جبر، باہم رضامندی ضروری ہوتی ہے۔ یہ اس لئے بھی کہ امام راغب نے کہا ہے کہ نکاح کا لفظ عقد یعنی معاہدہ کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ نکاح کے معاہدہ میں دو فریق یعنی بیوی اور شوہر کی رضامندی شامل ہوتی ہے اور کوئی تیسرا فریق، جسے ولی کا نام بھی دیا جائے، اُس کی رضامندی سے نکاح کے معاہدہ کو مشروط کرنا جائز نہیں کہلایا جاسکتا۔ ایسا کرنے سے تو اِکراہ/ جبر کے پہلو کے شامل ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ جبر کے نتیجہ میں اسلامی نکاح کا معاہدہ تو رہا ایک طرف دنیا میں کئے گئے ہر معاہدہ کی قانونی حیثیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔

نکاح کے لئے قرآن نے نہ کوئی تقریب مقرر کی ہے اور نہ کوئی رسم۔ رسوم و تقاریب معاشرتی ضرورتیں ہیں۔ البتہ بعد کی پیچیدگیوں سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ اس معاہدہ کی کوئی شہادت بھی ہو اور اسے کہیں منضبط یعنی درج بھی کر لیا جائے۔ اسی بنا پر پاکستان کے رائج الوقت مُلکی قانون میں معاہدہ کی طرز پر نکاح کی پوری شرائط کے قانونی طور پر حکومت کی طرف سے متعارف کردہ فارم پر اندراج اور اُس حفاظت سے حکومت کے ریکارڈ میں رکھنے کا قانونی تقاضہ پورا کیا جاتا ہے۔

معاہدہ کے لئے پھر ضروری ہو جاتا ہے کہ دونوں معاہدہ کرنے والے افراد قانونی طور پر عاقل و بالغ ہوں کہ وہ خود اپنی عقل و فکر سے اور بغیر کسی قسم کے جبر کے معاہدہ کرنے کا فیصلہ کر سکیں۔

خصوصی طور پر اسلامی معاشرہ میں نکاح کے مقاصد کے حصول میں دونوں میاں بیوی کے خاندان بھی ہر ممکن مدد و تعاون

اور مشاورت مہیا کرتے ہیں۔ لہذا نکاح کے معاہدہ میں اجتماعی طور پر شرکت کرنے کی وجہ سے دونوں کے خاندان ایک ہی خاندان کہلائے جانے کے مستحق ہوجاتے ہیں۔ اِس ایک فیملی میں سبھی کا گھر میں قرآنی اقدار اپنانے کا ایک ہی مقصد اور منزل ہوتی ہے۔ گھرانہ کی اِس قسم کی کیفیت کو قرآن جنتی معاشرہ کے وجود میں لانے کا ایک لازمی جزو قرار دیتا ہے۔ مغربی ممالک میں اِس ایک فیملی کے تصور کو اتنی پذیرائی حاصل نہیں ہوسکی، جس کی وہ مستحق ہے۔ لہذا اِن فیملی ہونے کے ناطہ سے ہم اجتماعی ثمرات کے حصول کے مستحق ہوجاتے ہیں، جبکہ مغربی معاشرہ اُن سے محروم ہوتا ہے۔

قرآن کا، گھر کی جنتی زندگی کی کیفیات کو برقرار رکھنے کی اقدار کا تعین:

اسلامی معاشرہ میں گھر کی زندگی کو ایک خاص مقام حاصل ہے اس لیے کہ اسلام جس قسم کا معاشرہ بنانا چاہتا ہے، وہ اس کی ابتداء گھر سے کرتا ہے۔ اس کے نزدیک گھر ایک چھوٹی سی مملکت یا معاشرہ ہے، جسے اسلامی مملکت یا اسلامی سوسائٹی کا صحیح صحیح نمونہ ہونا چاہیے۔ اِس سمت سفر کرنے اور منزلِ مقصد کے حصول کے لئے قرآن اصول و اقدار فراہم کرتے ہوئے لوگوں کی راہنمائی کرتا ہے۔ اِن میں سے چند بنیادی قسم کے اصولوں کو یوں بیان کیا جاتا ہے کہ

وہ گھر کے سب سے بڑے فرد (بزرگِ خاندان) کے احترام کی خصوصی طور پر بھی دعوت دیتا ہے اور اِس دعوت کی بنا پر بھی اُس کی ذمہ داری قرار دیتا ہے کہ وہ جس طرح اپنے آپ کو ہر تباہی سے بچانے کی کوشش کرتا ہے، اسی طرح اپنے گھر کے لوگوں کو بھی ہر قسم کی بربادی سے محفوظ رکھنے اور محبت و ہمدردی کے جذبات پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

اِس ضمن میں قرآن درجِ ذیل اقدار کی لازمی پابندی کی تلقین کرتا ہے کہ

1۔ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا (66:6)

''اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو جہنم کی تباہی سے بچاؤ۔''

گھر کو جنتی کیفیت لئے ہوئے ایک مثالی گھرانہ بنانے کے لئے وہ صِرف بیوی کو نہیں بلکہ شوہر اور بیوی کو ایک دوسرے کا زوج قرار دیتے ہوئے ہدایات دیتا ہے کہ

2۔ وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً (30:21)

''اللہ نے تمہاری جنس سے تمہارے جوڑے پیدا کر دیئے ہیں (عورت کے لیے مرد اور مرد کے لیے عورت)۔ جوڑا بنانے سے مقصد یہ ہے کہ تمہیں ان سے آرام وسکون ملے۔ اس کے لیے، اس نے تم دونوں میں محبت اور ہمدردی کے جذبات پیدا کر دیئے ہیں۔''

3۔ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَن تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا (4:19)

''تمہارے لیے یہ ہرگز جائز نہیں کہ تم زبردستی عورتوں کے مالک بن جاؤ۔''

اللہ تعالیٰ نے مردوں اور عورتوں میں پیدائش کے لحاظ سے جو فرق رکھا ہے اس کی رو سے اولاد کی پیدائش اور اس کی پرورش اور تربیت کی بیشتر ذمہ داری عورت کے سر پر ہوتی ہے۔ اس میں اس کا بہت سا وقت صرف ہو جاتا ہے۔ اس لیے رزق کمانا مردوں کے ذمے ہے۔

4۔ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (4:34)

’’عورتوں کو رزق بہم پہنچانا مردوں کی ذمہ داری ہے۔‘‘

اِس فریضہ کی ادائیگی میں مرد کو اسے بطور فریضہ کار لینے اور کسی قسم کے بھی فوقیت اور تفاخر کے جذبات رکھنے سے ممانعت کی گئی ہے۔

5۔ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا (4:19)

’’اپنی بیویوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا کرو۔ اگر ان کی کوئی بات تمہیں (کسی وقت) ناگوار بھی گزرے (تو اس پر جھٹ سے غصے میں نہ آجاؤ) ہوسکتا ہے کہ تمہیں ایک بات ناپسند ہو اور خدا نے اس میں تمہارے لیے بڑے فائدہ کی بات پوشیدہ رکھی ہو (اس لیے صبر و تحمل سے کام لیا کرو)۔‘‘

عورت کو بھی اُس کے تقسیمِ کار کے لحاظ سے اُسے احساس دلایا ہے کہ اولاد کی پرورش ماں باپ کا سب سے پہلا فریضہ ہے۔ ان کی طرف سے غفلت برتنا گویا اولاد کو قتل کر دینا ہے۔ جو قرآنِ کریم کی رو سے بہت بڑا جرم ہے۔

6۔ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ (6:140)

’’جو لوگ اپنی اولاد کو احمقانہ جہالت کی بنا پر مار دیتے ہیں، ان کے لیے تباہی ہے۔

اولاد کے متعلق تنبیہ بھی کی گئی ہے کہ اپنی اولاد کی فضول خرچیوں کے لیے یا ان کے لیے جائیدادیں بنانے کی خاطر، ناجائز طریقوں سے کمائی کرنا بھی بہت بڑا جرم ہے۔ اس قسم کی اولاد یا بیویاں (جن کی خاطر انسان کو ناجائز طریقے سے کمائی کرنی پڑتی ہے) انسان کی دشمن ہوتی ہیں۔

7۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ (64:14)

’’تمہاری بعض بیویاں اور بچے ایسے بھی ہوتے ہیں، جو تمہارے دشمن ہوتے ہیں۔ لہٰذا ایسے بیوی بچوں سے بہت بچنا چاہیے‘‘۔

لہٰذا خود بھی حلال و طیب کمائی کھانی چاہیے، اور اپنے بچوں کو بھی رزقِ حلال کھلانا چاہیے، اور ان کی صحبت، تربیت اور تعلیم کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے۔

جاری ہے

Manzil ba Manzil (منزل بہ منزل)
Chapter 2: Life's Essence (*Khum-e Zindagi* - خم زندگی) – Message to Fellow-Seekers

2

(Tulu-e-Islam Convention, November, 1957)

By G. A. Parwez

(Translated by: M. Alam)

Longing for the past melodies and chords;
The heart is sad; craving for lovely words!
Synagogues, Mosques, Shrines, and Minsters;
All are corrupted by half eyed Ministers!

Or, for example, when Tulu-e-Islam said that creating division in Islam is شرک (*Shirk*) and differences in *Ummah* is Allah's punishment, then an intense hostility erupted against it. It was said that this was denial of hadith; that this was against the Sunnah of the Prophet (PBUH) which says that creating differences in my *Ummah* is mercy. But now it is being proclaimed by a group, which is the staunchest follower of hadith, *Jamat Ahle Hadith*, that:

This narration attributed to the Prophet (PBUH) is fictitious and unauthentic; and therefore it should not be used for evidence for hadith. [*Al-I'tisaam*, August 2, 1957]

This is the reality, my dear friends. And I am telling this not with any pride or swagger but with all the humility before the Almighty, and with tears in my eyes and with shaking lips: that in this short period of time the thick curtains which were covering the Quranic light and its life-giving ideology for so long, have been lifting so quickly that we may not be able to imagine the importance of its impact – because this light is so close to our eyes. But when future generations will cast their eyes on this period then they may be able to judge the proper impact of this inner revolution occurring in human minds and hearts.

People will appreciate my heart-ache after I am gone;
Their path will be easy, as thorns in the way are gone!

***

Law commission

A clear example of this opposition of the Quranic thought is the storm that has erupted against my inclusion in the law commission as a member. This was reported in the October 1957 issue of the Tulu-e-Islam. Please note that there are members in this commission against whom these very same people (who oppose me) have given fatwa of Quran-denial or hadith-denial, but, about whom, these custodians of religion do not express any brouhaha for *their* inclusion in the law commission. But all their poison-tipped arrows of opposition have been directed only against yours truly so much so that they started calling the commission "Parwezi commission!" It is obvious that if their opposition was based on any principle then they would have opposed everyone equally whom they considered Quran-denier or hadith-denier. But that was not the case. All their charges were directed against me, which is a clear

proof that their opposition was not based on love of hadith. The "crime" they have charged me with is that I keep the Book of Allah at the top and I declare it to be *the* touchstone for right and wrong. I have already clarified my position regarding hadith in last year's convention, which is: that I consider every hadith that is not against the Quran or if it does not stain the character of the Prophet (PBUH) to be true. But if they charge someone as hadith-denier who says this, then please forgive me, no one is exempt from this charge. As for the legal status of hadith, I have discussed this issue in detail elsewhere and there is no need to repeat it here.

The most interesting aspect of this opposition is that the mandate of the law commission is only to provide recommendations about the current laws in the light of the Quran and Sunnah. It does not have any legislative or executive power. That authority only belongs to legislative assembly which can accept or reject those recommendations. This legislative assembly consists of many non-Muslim members. But how ironic that those who have launched a barrage of opposition against me have tacitly recognized non-Muslims as having legal authority to judge whether or not any laws are according to the Quran and Sunnah? My dear friends, do you see the pun here? These people – the so-called custodians of religion – have no problem with non-Muslims sitting in legislative assembly with authority to judge whether or not a law is Islamic; but they cannot stand a Muslim who has a different view of hadith, being included in a commission that can only offer recommendations? And this is being done to a person who has always maintained that a legislative assembly cannot be called Islamic if it includes non-Muslims!

The reason for opposition

But, my dear friends, this opposition to the Divine message is nothing new. The Quran tells that it has been going on since the beginning: وَمَآ أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَآ إِنَّا بِمَآ أُرْسِلْتُم بِهِۦ كَٰفِرُونَ (34:34) – Whenever We sent a messenger to a nation to warn them about the destructive effects of their unjust system, its affluent class who were lost in the pursuit of pleasure and were used to easy life at the expense of the labor of others, told Our messengers, "Behold! We deny that there is any truth in whatever you say and we are not ready to accept it."

The evidence from history about the real reason for their opposition is worth noticing. This opposition had reached its high point during the time of Jesus and was led by the religious priesthood – the custodians of Jewish sharia who were thirsty for the blood of Jesus and wanted him assassinated. They were opposed because of the bold revolutionary proclamations made by Jesus – and other messengers – against religious priesthood. Why did the religious priesthood put up such a strong opposition to all the prophets without exception? One cannot find the answer to this in the popular four books of the Bible. But there is another Bible called the Bible of Barnabas which was hidden by Christians about which I have written the story of how it came to the surface, in my book *The Heavenly Books of Religions*. It is written in the Bible of Barnabas that the priests were very worried with Jesus's

pronouncements. They went to their head-priesthood and said to him that if this person were to become the king then what we will do? It is clear from this that they were worried about their livelihood if Jesus came to power because Jesus was not some kind of monastic spiritual otherworldly person as he is portrayed out to be. In fact, he was a revolutionary figure who wanted to establish the rule of God on earth. From this it is clear that the priests were worried that their freeloading will be over if this person came to power; that they would no longer remain parasites of the society but they would have to earn their livelihood by working hard just like other people; or they would have to beg in the streets by becoming beggars.

Priests never work like everybody else for their bread. They receive it as gifts from people. So, the priests at the time of Jesus had everything worked out with the Roman governor. They were happy with this arrangement. Roman secular government didn't interfere in their religious affairs and didn't care how they practiced their religion. But with the arrival of Jesus and with his revolutionary sermons the priests became very worried. They told their people that, now, if we do any wrong then we are able to please our merciful God by prayers and sacrifice. But if this person were to become the king then we would never be able to please him because he will enforce the sharia of Moses.

Did you notice my friends, what was the real reason of priesthood's opposition to all the messengers? My dear friends, after this evidence from history, there is no need to say anything more:

Neither the battlefield is new nor are the enemy's opposition to the truth is new;
It's the same old struggle for universal justice; the same old enemies posing as new!

***

Searching for solutions

Now, my dear friends, I want to draw your attention to another issue. During the Pakistan movement we thought that once Pakistan was created all our difficulties will be resolved. Pakistan became a reality and our problems and difficulties remained as usual. Again, we were told that once the constitution is created our problems will be solved. The constitution was created and a fatwa was passed that: "By the Grace of Allah, our state has now become Islamic [*Jamat-e Islami*]." Well, instead of easing, our problems became even worse after this constitution was put in place. Now we are hoping that once "Islamic laws" are in place our situation will improve. Please remember! Just as when Pakistan was created our situation did not improve; and just as when the constitution was put in place our problems didn't get resolved; the same way when our current laws are made to comply with the "Quran and Sunnah", our entangled problems won't get disentangled.

Basic framework of Islamic state

For the solution to our problems there are two essential requirements. First, our constitution should really and truly be Islamic. According to Islamic constitution, the

reason and goals of the state – and, in fact the very justification for the existence of the state – are: 1) the state must be fully responsible for providing all the basic needs to all its citizens; 2) the state must provide the means and sustenance required to develop the human potential of all its citizens and there must not be any discrimination between individuals on any basis; and 3) Dispensation of justice should be free for all its citizens without any fear or favor; and no decision must cross the boundary set by Allah.

If anyone in this state sleeps hungry in the night; if anyone in this state remains without clothes; if a family in this state remains without a roof over its head; if a child in this state remains without proper education and training; if a patient in this state dies due to lack of healthcare; if anyone's life, property, dignity, or honor is not protected; if anyone does not receive justice for free according to Allah's laws – that is, if anyone feels helpless and alone for anything in this state; then that state is absolutely not entitled to call itself Quranic state, and its laws and its constitution cannot be referred to as Quranic. In fact, Caliph Umar (R) went so far as to say that even if a dog were to die because of hunger on the banks of Euphrates, then he will be accountable for this on the Day of Judgment. In the words of Iqbal:

No one is deprived; no one remains helpless or miserable;
This is the essence of Islamic Sharia, plain and simple!

The next requirement is that everyone (including the head of the state) entrusted with carrying out state duties and responsibilities must themselves believe in these basic concepts in their hearts; must take the oath to enforce these values; and must lead their own lives within the bounds set by Allah.

The state would not reflect these concepts unless these values take such deep roots in its citizens' hearts that they will boldly proclaim: فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ۝ عَلٰٓی اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ۝ (70:40-41) – The system of Divine Nourishment, which in a very organized manner is spread all over the universe from east to west, testifies to the fact that We are fully capable of replacing them with better people those who obstruct the establishment of the system of Universal Sustenance. The opponents can neither go out of Our control, nor can they thwart Our schemes. This, my dear friends, is the correct democracy that the Quran came to teach.

Our responsibility

But this feeling will not be born in people's hearts unless the Quranic thought is spread in a way that affects the entire spectrum of the society and engulfs the whole environment. And this is the responsibility, my dear friends that *you* have undertaken. From this you can very well imagine how important this duty is, and how difficult and exhaustive this work is? If you want to hear in clear-cut words then please pay attention: Pakistan's future and the implementation of the Quran's system in it are linked *only* to your efforts and deeds. I have used the word "only" not for emphasis but to mention that it is the reality and the fact on the ground: that the voice of Quranic thought is coming from *only* your movement and from nowhere else.

Otherwise, you will hear only this from every quarter:

Where is the Arab who opened the evening ceremony?
Where is the Ajam who was alive with romance of love?
Is the bowl empty inside the cloak of the Sufi or is lost?
Where is the wine he laments, but no one pays attention?

So, my dear friends, think about it? If this voice of Tulu-e-Islam gets suppressed due to our weakness or shortcoming; or due to lack of our courage or mistake – then how serious our crime will be seen in the divine court of Nature? And how severe a punishment will be announced against us from this divine court of justice? Then the deprived and suffering humanity will hold us accountable because we have told them that the cure of their disease, if it is there anywhere, it is only in this elixir of Quranic thought that is with us. And if this thread of hope for their cure is cut from them then they would stand up on the highway of life and block our way, and will question us:

If the urn was empty from the elixir of Quranic thought;
Why did you light a shining lamp at the door of your tavern?
If you're unable to discharge the duties in the tempest of this life;
What was the point in joining this passionate way of life?

Think my dear friends, what will be our response?

Therefore, if you want to join this movement to propagate its message then you should accept this responsibility after due thought and understanding. Otherwise, the effect of failure of this mission will very deep and extensive. Also, as I have mentioned repeatedly, those who volunteer to invite others to this call must first purify their own character and personality. Unless there is change in our own thoughts, and unless its proof is borne out by our own actions, we should not consider fit to deliver this revolutionary message. I mentioned this last year and I want to repeat again that this phase of creating Quran's revolution requires extraordinary courage and patience. This journey is only possible to cover on the basis of purity of thought and strength of character. There is no opportunity in it for any show off or gaining any reward, or even the expectation of receiving any thankyous. In it, like other parties, there are no chairs for positions to be occupied; and no status symbols to be enjoyed. Bazm-e Tulu-e-Islam is not the name of a party. These are just organized efforts to propagate Quran's thought and its message. That's it. Its manifested form and the actual realization of the Quranic thought, called the Quran's system of universal sustenance, is the ultimate goal of this movement. The sooner you broadcast this message, the sooner this system will get established. Even in normal situation who doesn't want this system to get established soon, and to become the center of life and attraction for universal humankind? Who among us doesn't wake up in the night and prays:

O rider of the stead of time! Come soon;
O light of the prospective eye! Come soon!

Communism's flood

But considering that the condition of the country is deteriorating fast, we should not delay even one bit in establishing this system of universal sustenance. The country has been engulfed in poverty and hunger for a long time. But now the inflation is touching the roof so much so that even the bread is becoming out of reach of many people. These are the times when communism spreads like fire, and, which can only be stopped by the system of universal sustenance. People at least, at the present time, are willing to listen to those who want to propose a system that could solve the issue of bread while, at the same time, protecting people's attachment to Islam. Then people will think that this system is better than communism. But once communism spreads then, I am afraid; people will not listen to such talks. Then our country will become like the central Asian republics that may ask for freedom to pray and be allowed to recite the Quran. From this you can very well imagine at what crossroads of history we are standing; what critical period of history we are passing through; and what is being expected of us by the demand of the times. It is sad that our custodians of religion are completely oblivious to this onslaught of atheism and non-Islamic flood. They are engulfed in Shia-Sunni disputes and they want to drag the people in this sectarian strife. They consider discussing such sectarian issues as a great jihad:

Is the son of Marry dead, or is eternally alive?
Are the attributes separate from God, or aren't?
Is the one who is supposed to come, is Jesus?
Or, is he someone who will have his attributes?
Are the words of the Quran new, or they are ancient?
In which ideology is the salvation of the dead Ummah?

These custodians of religions are busy encircling their sculpted idols and the devil has commissioned his agents in full force to keep shooting tranquilizer darts at people filled with subliminal messages:

Keep them busy reciting Allahu every morning;
Make them habituated to monastic way of living!

This way the devil makes sure that the true message of the Prophet (PBUH) remains hidden from people's eyes forever. This way the devil makes sure that the true Sharia of the Prophet (PBUH) never comes out into the open. And, on the other side are the politicians. There is no better way to portray them than what the Quran itself has said: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ (14:28) – Have you not considered those who exchanged the favor of Allah for disbelief and settled their people [in] the home of ruin? [Asad]. There were nations on whom Allah had bestowed His bounties but their leaders used these bounties against Allah's Laws and thus led their caravan to a market where none was interested in their worthless merchandise. Our leaders have dragged the people to Hell and are themselves busy fire-dancing. They don't care what happens. So, my dear friends, under these conditions you can very well imagine that your responsibility becomes even more important and serious.

At this point I want to mention an issue that many friends find it confusing and often ask me about it. They say that other movements are moving fast and our movement is moving very slowly. This is true but the people who say this ignore the fundamental difference between common public movements and the one that is based on revolutionary call for establishing the Quran's universal sustenance.

A fundamental difference

Please note that whoever stands to promote the status quo and follows the establishment – without paying any attention to right and wrong – his life journey becomes very easy and full of happiness. For him, every valley is picturesque and full of beauty, and every corner filled with the smell of popular fragrance. The very first day when he raises his voice he finds thousands of echoes in his support. Whenever he speaks he makes sure that that is what people want to hear. When he provides "proof" for the existing rites and customs – and which rites and customs are not there for which some "rational proof" cannot be provided – then a great crowd of people confer on him the title of "the greatest thinker" of the time. Wherever he goes thousands of people follow him. This way he becomes the undisputed leader of the people. His followers shower him with flowers and slogan of "long live, our leader" wherever he goes; and they submit to his every command in blind obedience. He is provided with all the comforts and conveniences of life; and his followers circle around him always ready to serve him. His every work is done free of charge by his followers because they think that serving him brings thousands of blessings. Whomever he considers his opponent or a critic, all he has to do is to tell his follower that this person is questioning your ancestors and their sacred ways – and then his followers make sure that that person is taken to task or he is disappeared from their way, while all the while considering this effort as "jihad" in the way of God. And for this purpose, a mound of wealth is put at the leader's feet; and groups of volunteers are ready to sacrifice their lives at his slightest behest. In short, anyone who stands to uphold the status quo and people's prevalent beliefs an customs garners instant fame and fortune and his movement spreads like fire.

In contrast, think about a movement which, instead of moving with the flow of the popular wave, flows against it and tries to channel it in the right direction. This movement takes every belief or ideology and tests it against the touchstone of حق (*Haq*) and باطل (*Baatil*) and declares it as such without mincing any words what is revealed by this touchstone. When the caller of this movement points out the prevalent wrong ideologies and beliefs then he finds himself alone in this call. He does not find any trustee and confidante. No one comes out in favor of his call. No one wants to stand shoulder to shoulder with him. He takes his message from place to place and says to everyone:

Come to another place to learn eloquence;
But this sounds as strange speech in the town!

And no one wants to listen to him. He gets tired and sits down in deep thought and

reflects:

May be I am the first human being from another world!

But the truth of his message and his deep faith in that truth does not let him sit quietly. He stands up again and tries to give his message in a different style. Some people come to him and appreciate his message and claim to agree with him. But knowing that how harmful their superficial knowledge could be to themselves and to this revolutionary movement, he tells them:

Birds in the garden don't recognize me;
Sitting in the branch-nest I am singing alone!
This is not for the faint hearted to manage;
Whose color changes due to fear or shame?

He keeps repeating his message like this until it starts reverberating in the environment and starts making an impact. The people who find this message threatening to their self-interests in this revolutionary message gang up against him. He finds alone in this crowd of opposition and prays to Allah:

Care taker of the night is my enemy;
So pour more oil in my lamp all night!

This is the revolutionary movement my friends, that you are a part of. You can very well imagine why it is so slow. But the reality is that you should consider yourselves fortunate that with such lack of resources, and in such a short time, this movement has produced such fruitful results. Otherwise, in most such movements its caller comes alone, and remains alone, and then departs alone, saying:

When I travelled on my journey past this world;
Everyone said that I knew this departed man!
But those who claimed to know did not have idea;
Whence he came from, what he said, and to whom!

That is, he has a mass of people around him but no one knows what his message is. These are the people about whom the German poet Rilke says:

Each torpid turn of the world has such disinherited children, to whom no longer what has been, and not yet what is coming belong.

That is, they are deprived of both the past and future. This is the state of the caller of a revolutionary movement: to whom the present system is false and the values for which he struggles to replace it with have not yet become perceptible in his life time. He comes alone in the world and after watering the soil of revolution leaves it to posterity to reap its fruits. He does not feel sad for why he himself did not see the fruits of his struggle? Now you can understand my brothers, why your movement is so slow.

***

Now, my dear friends, I want to say something about your organizational effort for this movement called Tulu-e-Islam, whose second annual convention is taking place right now. I was spreading the message of this movement on individual basis largely

through the monthly Tulu-e-Islam magazine for a long time. Friends who agreed with its message also tried to spread it individually. Few years back friends from the town of Mardan wrote that they have formed a Bazm (group) of friends aligned with and passionate about this movement's message. The purpose is to collectively try to understand and spread the message of Tulu-e-Islam in an organized way. I told these friends that the idea is good and your intentions are pure but please be extremely careful that this organized effort does not take the shape of a party, because if that were to happen then we will go against the very foundation on which the entire structure of Quranic thought and system stands. This is how my friends, the first Bazm came into existence. Thereafter, friends from other towns and cities formed similar Bazms. As I said, these Bazms were nothing more that organized group efforts to learn and to understand the Quran's message; and to think appropriate ways to spread it. There were no formal rules and regulations and no documented constitution or bylaws regarding the formal operation of these Bazms. These were just individual gatherings of friends passionate about Quranic thought, and eager to see its expression in the form of the system of universal sustenance in the real world. When the number of these Bazms increased, friends from Lahore suggested that there should be introduction of the people involved in these Bazms so that this work could be pushed further by the joint effort, cooperation, and coordination among the Bazms. This led to the first convention of Tulu-e-Islam. Those friends who participated in that convention may have noticed that this was a unique and substantive gathering of its type. It seemed as if it was a family gathering in which family members were talking about love and affection; and thinking of ways to enhance and promote the wellbeing of the family. There was a special kind of beauty in the simplicity of this gathering and a special sense of purity in this beauty. All these things were there but there was this fear in my heart that – God forbid – if this movement were to turn into a party then it will nullify my lifelong effort. Some of my friends say that you are too sensitive in this matter. But what can I say to them except to say that?

I have seen the virtuous one broke his wine cup?
And multiple colors in bubbles bursting in the river!

If you remember, this was my (real or imaginary) fear I had and that is why I stressed so much that this group effort must not become tainted with party color.

Underground opposition

It seems the success of last year's convention had created turmoil in the hearts of those opposed to the thought and the message of Tulu-e-Islam. So, they devised a new tactic for their sinister activities against it. The Quran tells us regarding the *People of the Book* that when all their destructive activities failed to harm the revolutionary movement of Islam then they changed their gear and adopted a new weapon for their opposition. They had consultation among themselves: وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (3:72) –

Another section of the *Ahl-ul-Kit'ab* (People of the Book) resort yet another subversive technique. They tell their people: "Join the Muslims at the day break, pretending to be believers and leave them at the close of the day. During this period engage in discussions, designed to create doubts in their minds. In this way it is possible that some of them retract, from their Iman." They exhort their people: "Talk to the Muslims but only accept what is said by those who follow your religion. Do not admit that the like of what has been imparted to you has been imparted to others; and also do not admit that any plea advanced by your opponents will prevail against you before Allah."

Creating doubts, inciting suspicion

These were the people from whose conspiracies the Quran wanted to protect the believers (*Momineen*) when it said: مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ۙ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۙ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ (114:4-6) – While strictly adhering to the Divine Laws, we have to be extremely cautious of the people who come stealthily to whisper into peoples' ears and then withdraw, thus creating doubts in their minds and weakening their firm resolve. All this is done by people who are known and familiar to you as well as by strangers; as well as through intangible forces (which operate through imperceptible psychological propaganda). In order to sustain the Divine System, one has to be very careful and cautious of these evil and destructive forces. The only way to do so is to always fully obey the Divine Laws. By this they wanted to weaken your resolve: وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ۙ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ (113:4-5) – The opponents of this System will unleash propaganda which, through its psychological effect, could weaken our firm resolution; dampen our spirits; and create doubts in our minds. This may result in our convictions being shaken. Therefore, we also have to be careful of and cautious about such activities of the opponents. Also, there will be people who will be extremely jealous of our successes. We also have to be careful of their jealously and malice. These are the evil and destructive forces which we have to remain careful about. The practical way to ensure this would be to fully obey the Divine Laws, thus remaining within their protective custody.

To be continued....

رسالہ نہ ملنے کی صورت میں مندرجہ ذیل نمبرز پر رابطہ کریں شکریہ

Cell: 0321-4460787 Phone: 042-35714546

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی قرآن کریم کے احکام وقوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر امت کے مشورہ سے متعلقہ امور کے فیصلے۔ اس طریق کو خلافت علیٰ منہاج رسالت کہا جاتا ہے۔

-8 بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہوگیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ اس سے امت میں انتشار پیدا ہوگیا۔ خلافت کے زمانے میں تمام امورِ دین کے نظام کے تابع رہتے تھے۔ لیکن بعد میں مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہوگئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

-9 ہمارے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو امت کو احکام وقوانین خداوندی کے مطابق چلائے۔ اس نظام کی بلند ترین اتھارٹی کو مرکز ملت کہا جائے گا اور اس کی طرف سے جاری شدہ احکام کی اطاعت خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت کے قائم مقام قرار پائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانین خداوندی کے تابع ہوگی۔

-10 چونکہ دین کا نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہوگا' اس لئے اس میں موجودہ ثنویت ختم ہوجائے گی۔ یعنی اس میں یہ نہیں ہوگا کہ سیاسی معاملات کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے اور مذہبی یا شخصی امور کے لئے مذہبی پیشوائیت کی طرف۔ اس میں یہ دونوں شعبے باہم گر مدغم ہوجائیں گے۔

-11 جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہوجاتا' امت کے مختلف فرقے جس جس طریق پر نماز' روزہ وغیرہ اسلامی احکام پر عمل کر رہے ہیں' کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کوئی رد و بدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کر کے اسے ''خدا اور رسول ﷺ'' کا طریقہ قرار دے۔ یہ حق قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کو پہنچتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ امت کے اختلافات کو مٹا کر اس میں وحدت پیدا کرے۔

-12 قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ نظام تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی' روٹی' کپڑا' مکان' علاج' تعلیم وغیرہ بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔

-13 قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی اور نظام میں جذب ہوسکتا ہے نہ ان سے مفاہمت کرسکتا ہے۔ خواہ وہ مغرب کا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام ہو' یا سوشلزم کا آمرانہ اشتراکی نظام۔ اس کے نزدیک یہ سب نظام ہائے زندگی غیر خداوندی ہیں لہٰذا باطل۔

-14 جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو' یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

-15 ہم' رسول اللہ ﷺ کے بعد' ہر قسم کے مدعی وحی کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

-16 طلوع اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے (اسے فرقہ اہل قرآن سے بھی کوئی تعلق نہیں)' نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک دین میں فرقہ سازی شرک ہے۔ امت کے مختلف فرقے جس طریق سے نماز' روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے ہیں' ہم ان میں کسی قسم کا رد و بدل نہیں کرتے۔ ہم صرف قرآن کریم کی تعلیم کو عام کرتے ہیں تا کہ کسی طرح پھر سے قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کا قیام عمل میں آسکے۔ یہ ہے ہمارا مقصد' جسے ہم برسوں سے دہراتے چلے آرہے ہیں۔

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL. 69
ISSUE
9

Monthly **TOLU-E-ISLAM**

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
Web:www.toluislam.com www.facebook.com/talueislam/

6 ستمبر یومِ دفاعِ پاکستان

تم دشمن کے مقابلے کے لئے ہر وقت تیار ہو۔ امکان بھر سامان حفاظت فراہم کرو۔ اپنی سرحدوں کو فوجی چھاؤنیوں سے مستحکم رکھو کہ تم ان کے ذریعے ان لوگوں کو خائف رکھ سکو جو تمہاری ذات کے بھی دشمن ہیں اور نظامِ خداوندی کے بھی دشمن اور ان کے علاوہ انہی جیسے اور دشمنوں کو بھی جن کا ابھی تمہیں علم نہیں ہوا، اللہ کو ان کا علم ہے۔

(مفہوم القرآن سورۃ الانفال 60:)